عظمتِ قرآن
مولانا وحید الدین خاں

عظمتِ قرآن
مولانا وحیدالدّین خاں
القرآن کلام اللہ غیر مخلوق

فہرست

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

دیباچہ

اس مجموعہ میں قرآن کے تین پہلوؤں پر مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلے اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا تیسرے یہ کہ قرآن ایک کتاب دعوت ہے۔ اور اس کی دعوت میں اتنی قوت ہے کہ جب بھی اس کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے لایا جائے گا وہ اقوامِ عالم کو مسخر کرلے گا۔

قرآن سے پہلے بھی خدا کی طرف سے بہت سی آسمانی کتابیں اتری تھیں۔ پھر اس میں اور دوسری آسمانی کتابوں میں کیا فرق ہے۔

قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جو فرق ہے وہ اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ایک کامل ہے اور دوسری غیر کامل۔ ایک افضل ہے اور دوسری غیر افضل۔ مختلف آسمانی کتابوں میں اس قسم کا امتیاز قائم کرنا خود پیغمبروں کے درمیان امتیاز قائم کرنا ہے۔ اور خدا کے پیغمبروں کے درمیان امتیاز قائم کرنا یقینی طور پر صحیح نہیں۔

پھر دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن محفوظ ہے۔ جب کہ دوسری کتابیں اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں محفوظ نہیں۔ یہی محفوظیت قرآن کی اصل امتیازی خصوصیت ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اب وہ قیامت تک کے لیے واحد قابلِ اتباع اور واحد ذریعہ نجات کتاب ہے۔

تاہم قرآن کا محفوظ ہونا اور محفوظ رہنا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ اس آسمان کے نیچے پیش آنے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اس

وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس پر غور کیا جائے کہ دوسری کتابیں کیوں محفوظ نہیں رہیں۔ اور قرآن کیوں مکمل طور پر محفوظ حالت میں باقی ہے۔

خدا کو اگرچہ تمام موجودات پر کلی اختیار حاصل ہے۔ مگر متعین مدت کے لیے اس نے انسانوں کو بربنائے امتحان آزادی دیدی ہے۔ اسی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہر بار انسان یہ کرتا رہا کہ آسمانی کتابوں کو بدلتا یا ضائع کرتا رہا۔ آخر کار خدا نے انسانوں کے اوپر اپنا خصوصی فضل فرمایا۔ اپنی ہدایت کو مسلسل صحیح حالت میں باقی رکھنے کے لیے اس نے مزید حفاظتی اہتمام کیا۔ خدا کی خصوصی مدد سے رسول اور اصحاب رسول ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لائے۔ انہوں نے تمام شریروں کو زیر کیا۔ انہوں نے قدیم دنیا کو بدل کر ایک ایسی نئی دنیا پیدا کی جو اپنے ناقابل تسخیر موافق پہلوؤں کے ساتھ قرآن کی ابدی حفاظت کی ضامن بن جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ اور غالب صحیفہ بن گیا۔

پہلا حصّہ
دلائلِ قرأت

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔

البقرہ ۲

یہ خدا کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے
ڈرنے والوں کے لیے ۔

قرآن خدا کی کتاب

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتری ہے تو بہت سے لوگوں نے اس کو نہیں مانا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک انسانی تصنیف ہے نہ کہ خدائی تصنیف۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو قرآن کے مانند ایک کلام بنا کر لاؤ (ام یقولون تقولہ بل لا یومنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین، الطور ۳۴)

اسی کے ساتھ قرآن نے مطلق لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ وہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں (قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا، الاسراء ۸۸) قرآن ایک ابدی کتاب ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ابدی چیلنج ہے۔ قیامت تک کے تمام انسان اس کے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انسان کے لیے ناقابل تقلید ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کریں گے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء ۸۲)	کیا لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اس آیت میں " اختلاف " کی تفسیر تفاوت ، تعارض ، تناقض ، تضاد وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے ۔ آرتھر آربری نے اختلاف کا ترجمہ نامطابقت (Inconsistency) کیا ہے ۔

کلام میں تناقض نہ ہونا ایک انتہائی نادر صفت ہے جو صرف خدائے ذوالجلال کے یہاں پائی جاسکتی ہے ۔ کسی انسان کے لیے ایسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں ۔ تناقض سے پاک کلام وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ صاحب کلام کا علم ماضی سے مستقبل تک کے امور کا احاطہ کئے ہوئے ہو ۔ وہ تمام موجودات کا کلّی علم رکھتا ہو ۔ وہ چیزوں کی اصل ماہیت سے بلا اشتباہ پوری طرح باخبر ہو ۔ اس کا علم براہ راست واقفیت پر مبنی ہو نہ کہ بالواسطہ معلومات پر ۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ انوکھی خصوصیت ہو کہ وہ اشیاء کو غیر متاثر ذہن سے ٹھیک ویسا ہی دیکھ سکتا ہو جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں ۔

یہ تمام غیر معمولی اوصاف صرف خدا میں ہو سکتے ہیں ۔ کوئی انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہوسکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ تضاد اور تناقض سے پاک ہوتا ہے ۔ انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہوتا اس لیے انسان کا کلام کبھی تضاد اور تناقض سے پاک نہیں ہوتا ۔

خدائی خاصہ

کلام میں تضاد کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں ، یہ انسانی فکر کا لازمی خاصہ ہے ۔ یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ وہ صرف خدائی فکر کو قبول کرتی ہے ۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی متوافق نظریہ بنایا جاسکے ۔ خدا کے سوا دوسری بنیاد پر جو نظریہ بھی بنایا جائے گا وہ فوراً تضاد کا شکار ہو جائے گا ۔ وہ کائنات کے مجموعی ڈھانچہ سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا ۔

اس دنیا میں کسی انسانی نظریہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ فکری تضاد سے خالی ہوسکے ۔ اس بات کو ہم یہاں مثال کے ذریعہ واضح کریں گے ۔

نظریۂ ارتقاء

اس کی ایک مثال حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے ۔ ڈارون (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲) اور دوسرے

سائنسدانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔

اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علٰحدہ نوع نہیں۔ انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقار کی پچھلی کڑیاں ہیں۔ اور انسان اس سفر ارتقار کی اگلی کڑی ہے۔

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمراں رہا۔ مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے۔ وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا۔

مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی۔ یہ مدت ڈاردن کے مفروضہ ارتقار کو ظہور میں لانے کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔ سائنس دانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لیے سنکھ مہا سنکھ ملین سال سے بھی زیادہ لمبی مدت درکار ہے۔ پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیونکر وجود میں آگئیں۔ اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا۔ کجا کہ مفروضہ ارتقار کے مطابق لاتعداد مراحل سے گزر کر انسان جیسی اعلیٰ نوع ظہور میں آجائے۔

نظریہ ارتقار حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے۔ اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لیے دس لاکھ پشتوں کی مدت درکار ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعے کتے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنتے تو اس کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو بین سپرمیا (Panspermia) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں ہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو و نما پا سکے۔ مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقا کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقار (Emergent Evolution) کا نظریہ وضع کیا۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے نہ کہ کوئی علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یعنی اس خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لیے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی، وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

انسان کی لاعلمی

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "قاموس جہالت" اس قاموس کی ترتیب میں مختلف شعبوں کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں بتایا گیا ہے کہ قاموس جہالت میں ساٹھ نہایت معروف سائنس دانوں نے مختلف تحقیقی شعبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ دنیا کے متعلق ہمارے علم میں کون سے بامعنیٰ خلا پائے جاتے ہیں:

In the *Encyclopaedia of Ignorance* some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world.

یہ کتاب درحقیقت اس واقعہ کا علمی اعتراف ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ کسی بھی میکانیکل توجیہہ کو قبول نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر پروفیسر جان مینارڈ اسمتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقار ناقابل حل اندرونی مسائل (Built-in problems) سے دوچار ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں۔ مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقار زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہہ آپ ہے۔ کیونکہ خدا ایک صاحب ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ چونکہ ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لیے نظریہ ارتقار اس دنیا میں بے توجیہہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقار کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے۔ جب کہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

علم سیاست

یہی معاملہ فلسفہ سیاسیات کا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار کے الفاظ میں: سیاسی فلسفہ اور سیاسی اختلافات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ کہ کس کو کس کے اوپر اقتدار حاصل ہو:

> Political philosophy and political conflict have revolved basically around who should have power over whom (14/697).

اس میدان فکر میں پچھلے پانچ ہزار سال سے اعلیٰ ترین انسانی دماغ اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود علم سیاسیات کا مربوط نظام بنانے کے لیے وہ چیز دریافت نہ ہو سکی جس کو اسپنوزا نے علمی بنیاد (Scientific base) کہا ہے۔

علم سیاسیات میں ایک درجن سے زیادہ مدارس فکر پائے جاتے ہیں۔ تاہم وسیع

تقسیم میں وہ صرف دو ہیں۔ ایک وہ جو شخصی اقتدار کی وکالت کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جمہوری اقتدار کے حامی ہیں۔ ان دونوں ہی پر سخت ترین اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ شخصی اقتدار کے نظریہ پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کیوں حاکمانہ اقتدار حاصل ہو۔ چنانچہ وہ کبھی قبولیت عام حاصل نہ کرسکا۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جس کو جمہوری اقتدار کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ عملاً اگرچہ یہ ایک مقبول نظریہ ہے مگر نظری اور فکری اعتبار سے اس پر سخت ترین شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمہوریت (ڈیموکریسی) کا نظریہ اس عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام انسان آزاد ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ روسو کی کتاب معاہدہ عمرانی (Social Contract) کا پہلا فقرہ یہ ہے:

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ ہوں۔

ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں حکومت بذریعہ عوام (Rule by the people) مگر عملاً یہ ناممکن ہے کہ تمام عوام کی حکومت قائم ہوسکے۔ سارے لوگوں پر سارے لوگ آخر کس طرح حکومت کریں گے۔ مزید یہ کہ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان (Social animal) ہے۔ انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہے رہے۔ بلکہ وہ سماجی مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں، انسان آزاد نہیں پیدا ہوا ہے۔ انسان ایک سماج کے اندر پیدا ہوتا ہے جو کہ اس کے اوپر پابندیاں عاید کرتا ہے:

Man is not born free. Man is born into society, which imposes restraints on him.

جب سارے عوام بیک وقت حکومت نہیں کرسکتے تو عوامی حکومت کا نظام کس طرح بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریے پیش کیے گئے۔ سب سے زیادہ مقبول نظریہ روسو کا نظریہ ہے جس کو اس نے رائے عامہ (General will) کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہ رائے عامہ حکمراں افراد کے انتخاب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح عوام کی حکومت عملاً منتخب

افراد کی حکومت بن جاتی ہے ۔ عوام کو انتخاب میں ووٹ دینے کی کسی قدر آزادی ہوتی ہے ۔ مگر ووٹ دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے جیسے کچھ افراد کے محکوم بن جاتے ہیں ۔ روسو نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایک شخص کی خواہش کی پیروی غلامی ہے ۔ مگر خود اپنے مقرر کردہ قانون کی پیروی کرنا آزادی ہے :

To follow one's impulse is slavery but to obey the self-prescribed law is liberty (15/1172).

ظاہر ہے کہ یہ جواب ناکافی تھا ۔ چنانچہ اس نظریہ کو دوبارہ سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا ۔ کیوں کہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ خوبصورت الفاظ کے باوجود منتخب جمہوریت عملاً منتخب بادشاہت (Elective monarchy) کا دوسرا نام ہے ۔ انتخاب کے بعد جمہوری افراد وہی کچھ بن جاتے ہیں جو اس سے پہلے شاہی افراد بنے ہوئے تھے ۔

اس طرح تمام سیاسی مفکرین تضاد فکری کا شکار ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا ۔ اعتقادی طور پر سب کے سب مساوات انسانی کو اعلیٰ ترین قدر مانتے ہیں ۔ مگر انسانی مساوات حقیقی معنوں میں نہ شاہی نظام میں حاصل ہوتی اور نہ جمہوری نظام میں ۔ شاہی نظام اگر خاندانی بادشاہت ہے تو جمہوری نظام انتخابی بادشاہت ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شاہی نظام کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی ۔ مگر جب شاہی افراد کی محکومی ختم ہو گئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے لیے دوسرا بدل صرف یہ ہے کہ نمائندہ افراد کی محکومی پر اپنے آپ کو راضی کر لیں ۔ دونوں نظاموں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ نئے حکمراں اپنے کو زمین پر عوام کا نمائندہ کہتے تھے ۔ جب کہ پرانے حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نمایندہ (Representative of God on earth) ہیں ۔

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس معاملہ میں انسان کی ناکامی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

The history of political philosophy from Plato until the present day makes plain that modern political philosophy is still faced with the basic problems (14/695).

سیاسی فلسفہ کی تاریخ ، افلاطون سے لے کر اب تک ،ظاہر کرتی ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ ابھی تک بنیادی مسائل سے دوچار ہے ۔

بادشاہت یا جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ کا حق انسانوں میں سے کچھ انسان کو دینا پڑتا ہے ۔ اس طرح دونوں نظام مساواتِ انسانی کی تردید بن جاتے ہیں ۔ جمہوریت عین مساواتِ انسانی ہی کے نام پر پیش کی گئی ۔ مگر وہ اپنے اندرونی تضاد کی وجہ سے برعکس نتیجہ کی حامل ثابت ہوئی ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی سیاسی فلسفہ ہے جو اس دنیا میں فکری تضاد سے خالی ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کا فلسفہ ہے ۔ قرآن خدائی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتا ہے :

یقولون ھل لنا من الامر من شئ . قل ان الامر کلہ للہ (آل عمران ۱۵۴)	وہ کہتے ہیں کہ کیا حکم میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے ۔ کہو کہ حکم سب اللہ ہی کا ہے ۔

یہ نظریہ فکری تضاد سے پوری طرح خالی ہے ۔ جب خدا حاکم اور تمام لوگ محکوم ہوں تو سارے انسان برابر ہو جاتے ہیں ۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کا تمام فرق مٹ جاتا ہے ۔ اب فرق صرف خالق اور مخلوق کے درمیان رہتا ہے نہ کہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان

خدا کی حاکمیت میں تمام انسان برابر کا درجہ پا لیتے ہیں ۔ کیوں کہ اقتدار انسانوں سے باہر ایک بالاتر ہستی میں تفویض کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس بادشاہت یا جمہوریت میں مساوات کی قدر باقی نہیں رہتی ۔ کیونکہ ان میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صاحبِ اقتدار ماننا پڑتا ہے ۔

خدا کی حاکمیت کا نظریہ ایک مربوط نظامِ فکر بناتا ہے جو ہر قسم کے تضادات سے خالی ہے ۔ جب کہ انسانی حاکمیت کا کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو تضاد اور تناقض سے پاک ہو ۔

تمام سیاسی نظریات کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کریں ۔ مگر انسانی نظام میں یہ تقسیم کبھی ختم نہیں ہو سکتی ۔ خواہ جو بھی

سیاسی نظام بنایا جائے۔ یہ صورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ کچھ لوگ ایک یا دوسرے نام پر حاکم بن جائیں گے اور بقیہ لوگ محکوم کی حیثیت اختیار کریں گے۔ مگر جب خدا کو حاکم مان لیا جائے تو یہ تقسیم اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔ اب ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان۔ حاکم اور محکوم کی تقسیم صرف خدا اور انسان کے درمیان رہتی ہے۔ باقی جہاں تک انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ ہے، سب انسان مساوی طور پر یکساں حیثیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ خدا کو بادشاہِ حقیقی مان کر سب انسان اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دیدیں۔ یہی واحد سیاسی نظریہ ہے جو فکری تضاد سے پاک ہے۔ دوسرا کوئی بھی نظریہ فکری تضاد سے خالی نہیں ہو سکتا۔

تضاد کی دو قسمیں

قرآن کی مذکورہ آیت (النساء ۸۲) میں جس تضاد یا نامطابقت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے دو خاص پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک بیان کتاب کے دوسرے بیان سے ٹکرا رہا ہو۔ خارجی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا بیان خارجی دنیا کے حقائق سے ٹکرا جائے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ان دونوں قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جب کہ کوئی بھی انسانی تصنیف ان سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اگر وہ ایک انسانی کلام ہوتا تو یقیناً اس کے اندر بھی وہی کمی پائی جاتی جو تمام انسانی کلام میں غیر استثنائی طور پر پائی جاتی ہے۔

داخلی تضاد

کلام میں داخلی تضاد حقیقۃً متکلم کی شخصیت میں داخلی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ داخلی تضاد سے بچنے کے لیے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ ایک کامل علم اور دوسرے کامل موضوعیت (Objectivity) کوئی انسان ان دونوں کمیوں سے خالی نہیں ہوتا۔

اس لیے انسان کا کلام داخلی تضاد سے پاک بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اس لیے صرف خدا کا کلام ہی وہ کلام ہے جو داخلی تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔

انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بہت سی باتوں کو اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ اس لیے قیاسی طور پر کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ ہر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ناپختہ عمر سے پختہ عمر کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناپختہ عمر میں جو بات کہتا ہے، پختہ عمر کو پہونچ کر وہ خود اس کے خلاف بولنے لگتا ہے۔ ہر آدمی کا علم اور تجربہ بڑھتا رہتا ہے اس بنا پر اس کا ابتدائی کلام کچھ ہو جاتا ہے اور آخری کلام کچھ۔ انسان کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ اس کی واقفیت ابھی مکمل نہیں ہوتی کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی نامکمل واقفیت کی بنا پر ایسی بات کہتا ہے جو اس کے بعد درست ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح آدمی کو کسی سے دوستی ہوتی ہے اور کسی سے دشمنی۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت۔ وہ کسی کے بارے میں سادہ ذہن کے تحت سوچتا ہے اور کسی کے بارے میں ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان پر کبھی غم کا لمحہ گزرتا ہے اور کبھی خوشی کا۔ وہ کبھی ایک ترنگ میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری ترنگ میں۔ اس بنا پر انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی ایک طرح کی بات کہتا ہے اور کبھی دوسری طرح کی بات بولنے لگتا ہے۔

خدا ان تمام کمیوں سے پاک ہے اس لیے اس کا کلام ہمیشہ یکساں ہوتا ہے اور ہر قسم کے تناقض سے خالی بھی۔

حضرت مسیح کی شخصیت

مثال کے طور پر بائبل کو لیجیے۔ بائبل اپنی ابتدائی حالت میں خدا کا کلام تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسانی ملاوٹ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کثرت سے داخلی تضادات پیدا ہو گئے بائبل کا وہ حصہ جس کو انجیل یا نیا عہد نامہ کہا جاتا ہے اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے۔ یہ نسب نامہ متی کی انجیل میں اس طرح شروع ہوتا ہے۔

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ

یہ مختصر نسب نامہ ہے۔ اس کے بعد انجیل میں مفصل نسب نامہ ہے جو حضرت ابراہیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں "یوسف" پر ختم ہوتا ہے جو اس کے بیان کے مطابق مریم کے شوہر تھے جن سے حضرت مسیح پیدا ہوئے۔

اس کے بعد قاری مرقس کی انجیل تک پہونچتا ہے تو وہاں کتاب کے آغاز میں حضرت مسیح کا نسب نامہ ان لفظوں میں ملتا ہے:

یسوع مسیح ابن خدا

گویا انجیل کے ایک باب کے مطابق حضرت مسیح یوسف نامی ایک شخص کے فرزند تھے اور اسی انجیل کے دوسرے باب کے مطابق حضرت مسیح ابن خدا (خدا کے بیٹے) تھے۔

انجیل اپنی ابتدائی صورت میں یقیناً خدائی کلام تھی اور تضادات سے پاک تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیانات میں تضاد پیدا ہو گیا۔

انجیل کے اس تضاد کی تاویل کلیسا نے ایک اور عجیب وغریب تضاد سے کی ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مطابق وہ مذکورہ یوسف کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں:

Christ's earthly father, the Virgin Mary's husband

مسیح کا ارضی باپ، کنواری مریم کا شوہر۔

کارل مارکس کا فکری تضاد

یہ مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال تھی۔ اب غیر مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال لیجئے۔ یہاں میں کارل مارکس کا حوالہ دوں گا۔ موجودہ زمانے میں مارکس کی ذہنی عظمت کا حال یہ ہے کہ امریکی پروفیسر جان گال بریتھ نے مارکس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

If we agree that the Bible is a work of collective authorship, only Mohammad rivals Marx in the number of professed and devoted followers recruited by a single author. And the competition is not really very close. The followers of Marx now far outnumber the sons of the Prophet.

John Kenneth Galbraith, *The Age of Uncertainty*
British Broadcasting Corporation, 35 Marylebone high Street, London, p. 77

اگر ہم یہ مان لیں کہ بائبل کئی اشخاص کی مشترکہ تصنیف ہے تو صرف محمد وہ دوسرے واحد مصنف ہیں جو معتقدین اور پیروؤں کی تعداد کے اعتبار سے مارکس کی برابری کر سکتے ہیں۔ پھر مقابلہ زیادہ قریب قریب کا نہیں۔ مارکس کے پیروؤں کی تعداد آج پیغمبر کے پیروؤں کی تعداد سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔

مگر ساری مقبولیت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مارکس کا کلام داخلی تضاد کا شاہکار ہے۔ مارکس کے فکر میں اتنے زیادہ تضادات پائے جاتے ہیں کہ اس کے خیالات کو مجموعہ اضداد کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

مثال کے طور پر مارکس نے دنیا کی تمام خرابیوں کا سبب سماج میں طبقات کا ہونا بتایا ہے یہ طبقات اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ (بورژوا یا سرمایہ دار) ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر دوسرے طبقہ (محنت کش طبقہ) کو لوٹتا ہے۔

اس کا حل مارکس نے یہ تجویز کیا کہ سرمایہ دار طبقہ سے اس کی ملکیتیں چھین لی جائیں اور ان کو مزدور طبقہ کے زیر انتظام دیدیا جائے۔ اس کارروائی کو وہ بے طبقاتی سماج (Classless Society) قائم کرنے کا نام دیتا ہے۔ مگر یہ کھلی ہوئی تضاد فکری ہے۔ کیونکہ مذکورہ کارروائی سے جو چیز وقوع میں آئے گی وہ بے طبقاتی سماج نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر ایک طبقہ کا قبضہ ختم ہو کر دوسرے طبقہ کا قبضہ شروع ہو جائے۔ یہ طبقات کا خاتمہ نہیں بلکہ صرف طبقات کی تبدیلی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ قبضہ ملکیت کے نام پر تھا اور

اب یہ قبضہ انتظام کے نام پر ہو گا۔ وہ چیز جس کو مارکس بے طبقاتی سماج کہتا ہے وہ عملاً سرمایہ دار طبقہ کی ملکیت کو ختم کر کے کمیونسٹ طبقہ کی ملکیت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

مارکس ایک ہی چیز کو ایک جگہ برائی کہتا ہے اور دوسری جگہ بھلائی۔ مگر سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کی وجہ سے اس کو اپنا یہ فکری تضاد دکھائی نہیں دیا۔ وہ ذرائع معاش کو سرمایہ داروں کے بجائے عہدیداروں کے قبضہ میں دے رہا تھا۔ مگر اپنے متعصبانہ اندھے پن کی وجہ سے وہ اپنے اس تضاد کو محسوس نہ کر سکا۔ ایک نوعیت کے دو واقعات میں سے ایک واقعہ کو اس نے انفرادی لوٹ کہا اور دوسرے کو اجتماعی تنظیم۔

قرآن اس قسم کے داخلی تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ اس کا کوئی بیان اس کے دوسرے بیان سے نہیں ٹکراتا۔ قرآن کے تمام بیانات میں کامل قسم کی داخلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

غیر متعلق مثال

قرآن کے مخالفین نے اس سلسلہ میں بعض مثالیں دے کر قرآن کے اندر داخلی تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ تمام کی تمام غیر متعلق مثالیں ہیں۔ گہرا تجزیہ فوراً ان کی غلطی واضح کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن نے ایک طرف یہ اعلیٰ اصول پیش کیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱) حدیث (خطبہ حجۃ الوداع) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھے (الناس من آدم وآدم من تراب) اس اصول کے مطابق عورت کا بھی وہی درجہ ہونا چاہیئے جو مرد کا درجہ ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔ ایک طرف قرآن مساوات انسانی کا علم بردار ہے اور دوسری طرف اس نے عورت کو سماج میں کم تر مقام دے دیا۔ چنانچہ گواہی کے معاملہ میں یہ قانون مقرر کیا کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی جائے گی۔

یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام میں عام حالات میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے مگر اس کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ

قطعی طور پر دوسری ہے۔ یہ حکم قرآن کی جس آیت میں ہے وہیں اس کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

واستشهدوا شهيدين من رجالكم فان لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرىٰ۔ (البقرہ ۲۸۲)

(جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائج تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یہ خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

> MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women but females are better with words, a Soviet scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr Vladimir Konovalov told the Tass news agency.

عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ

ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں ۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنس داں نے کہی ۔ ڈاکٹر ولادیمیر کو نوولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں ۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظ کی خصوصی صلاحیت ہے ۔

جب یہ ایک حیاتیاتی واقعہ ہے کہ عورت کی یادداشت فطری طور پر مرد سے کم ہوتی ہے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی جائے ۔ قرآن کا یہ قانون قرآن میں تضاد ثابت نہیں کرتا ۔ بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے جو تمام حقیقتوں سے باخبر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے احکام میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت پائی جاتی ہے ۔

خارجی نامطابقت

اس معاملہ کا دوسرا پہلو خارجی نامطابقت ہے ۔ یعنی کسی امر میں کتاب کے اندر جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب کے باہر پائی جانے والی حقیقت کے مطابق نہ ہو ۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمام انسانی تصنیفات میں پائی جاتی ہے ۔ انسان اپنی معلومات کے دائرہ میں بولتا ہے ۔ اور انسان کی معلومات کا دائرہ چونکہ محدود ہے ۔ اس لیے اس کی زبان یا قلم سے ایسی باتیں نکلتی رہتی ہیں جو خارجی صورت حال سے مطابقت نہ رکھتی ہوں ۔ یہاں ہم چند تقابلی مثالیں بیان کریں گے

قانون فطرت کی مثال

قدیم عرب میں ایک رواج یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر دیتا تھا کہ افراد خاندان زیادہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو سکے گا ۔ اس سلسلہ میں قرآن میں یہ حکم اترا :

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق	اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو
نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم	ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔
کان خطأ کبیرا ۔ (الاسراء ۱ ۳)	بے شک ان کو مار ڈالنا ایک بڑی غلطی ہے ۔

یہ اعلان گویا ایک قسم کا دعویٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں آبادی کا کوئی بھی اضافہ زمین پر رزق کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ انسانی تعداد کے مقابلہ میں غذائی اشیار کا تناسب ہمیشہ موافق طور پر برقرار رہے گا۔ جس طرح آج سب کو ان کی روزی مل رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی سب کو ان کی روزی ملتی رہے گی۔

مسلمان ہر دور میں اعتقادی طور پر اس اعلان کی صداقت کو مانتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی بھی وہ ذہن پیدا نہیں ہوا جس کو موجودہ زمانے میں تحدید نسل یا برتھ کنٹرول کہتے ہیں۔ وہ خدا کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے رزق کے معاملہ کو خدا پر چھوڑتے رہے ہیں۔ مگر اس اعلان کے ایک ہزار سال بعد انگریز ماہر معاشیات رابرٹ مالتھس (۱۷۶۶ - ۱۸۳۴) پیدا ہوا۔ ۱۷۹۸ میں "اصول آبادی" پر اس کی مشہور کتاب چھپی جس کا پورا نام یہ ہے:

An Essay on the Principle of Population as it affects the Future Improvement of Society.

مالتھس نے اپنی اس کتاب میں وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

Population, when unchecked, increases in a geometrical ratio. Subsistence only increases in an arithmetical ratio.

آبادی، جب کہ وہ بے قید طور پر چھوڑ دی جائے، جیومیٹری کے تناسب سے بڑھتی ہے۔ اشیار خوراک صرف ارتھمیٹک کے تناسب سے بڑھتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اضافہ اور غذائی اشیار کا اضافہ قدرتی طور پر یکساں نہیں ہے۔ انسانی آبادی کا اضافہ ۱ - ۲ - ۴ - ۸ - ۱۶ - ۳۲ - ۶۴ کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غذائی اشیار میں اضافہ کا تناسب ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ - ۸ رہتا ہے۔ یعنی انسانی آبادی میں اضافہ نہایت تیز رفتار ہوتا ہے اور غذائی اشیار میں اضافہ نہایت سست رفتار۔ اس بنا پر مالتھس نے کہا کہ زمین پر انسانی نسل کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ انسان کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے

ورنہ بہت جلد ایسا ہوگا کہ آبادی اور غذائی اشیاء میں غیر متناسب اضافہ کی وجہ سے فاقہ کا دور شروع ہو جائے گا اور بے شمار انسان بھوک سے مرنے لگیں گے ۔

مالتھس کی اس کتاب نے دنیا کی فکر پر زبردست اثر ڈالا ۔ اس کی تائید میں بے شمار لکھنے اور بولنے والے پیدا ہو گئے ۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی کوششیں شروع ہو گئیں ۔ مگر اب محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس کا اندازہ سراسر غلط تھا۔ مسٹر گوائن ڈائر (Gwynne Dyer) نے ان تحقیقات کا خلاصہ ایک مقالہ کی صورت میں شایع کیا ہے ۔ اس مقالہ کا عنوان بامعنیٰ طور پر یہ ہے : مالتھس جھوٹا پیغمبر

(Malthus: The False Prophet)

مقالہ نگار جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> It is the 150th anniversary of Malthus's death, and his grim predictions have not yet come true. The world's population has doubled and redoubled in a geometrical progression as he foresaw, only slightly checked by wars and other catastrophes, and now stands at about eight times the total when he wrote. But food production has more than kept pace, and the present generation of humanity is on average the best fed in history.

مالتھس کی موت کو اب ۱۵۰ سال گزر چکے ہیں اور اس کی سنگین پیشین گوئیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں ۔ دنیا کی آبادی جیومٹری کے حساب سے دگنا اور چوگنا ہو گئی جیسا کہ اس نے کہا تھا ، اس میں جنگوں اور حوادث کی وجہ سے بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے ۔ جب مالتھس نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت کی آبادی کے مقابلے میں آج دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا ہو چکی ہے ۔ مگر غذائی پیداوار بھی کچھ اضافہ کے ساتھ قدم بقدم چلتی رہی ہے ۔ اور انسان کی موجودہ نسل کو اوسط طور پر تاریخ کی سب سے بہتر غذا مل رہی ہے ۔ (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴)

رابرٹ مالتھس "روایتی زراعت" کے دور میں پیدا ہوا ۔ وہ اس کا اندازہ نہ کر سکا کہ جلد ہی "سائنٹفک زراعت" کا دور آنے والا ہے جس کے بعد پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنا ممکن ہو جائے گا ۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں زراعت کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں

اب ایسے منتخب بیج بوئے جاتے ہیں جو زیادہ فصل دینے والے ہوں ۔ یہی معاملہ مویشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کھیتوں کو زرخیز کرنے کے مزید طریقے دریافت ہو گئے ہیں ۔ نئی نئی کھادیں بڑے پیمانہ پر استعمال ہونے لگی ہیں ۔ مشین کی مدد سے ان مقامات پر کھیتی ہونے لگی ہے جہاں پہلے کھیتی کرنا ناممکن نظر آتا تھا ۔ آج ترقی یافتہ ملکوں میں کسانوں کی تعداد میں ۹۰ فی صد تک کمی کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کو دس گنا تک بڑھا لیا گیا ہے ۔ وغیرہ

تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) کا جو رقبہ ہے اس کے لحاظ سے اس میں ۳۳ بلین انسانوں کی آباد کاری کی گنجائش ہے جب کہ اس کی موجودہ آبادی صرف ۲ بلین ہے ۔ تیسری دنیا امکانی طور پر اپنی موجودہ آبادی کی دس گنا تعداد کو خوراک مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ ایف اے او (F.A.O.) نے اندازہ لگایا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی آبادی اگر بے قید طور پر بڑھتی رہے اور ۲۰۰۰ء میں چار بلین سے زیادہ ہو جائے تب بھی کوئی خطرہ کی بات نہیں ۔ کیونکہ اندازہ کے مطابق ، اس وقت جو آبادی ہو گی اس سے ڈیڑھ گنا آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے ذرائع پھر بھی تیسری دنیا کے علاقہ میں موجود ہوں گے ۔

خوراک میں یہ اضافہ جنگلوں کو کاٹے بغیر ممکن ہو سکے گا ۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عالمی سطح پر کسی غذائی بحران کا کوئی حقیقی اندیشہ ہے اور نہ علاقائی سطح پر ۔ مسٹر گوائن ڈائر نے اپنی رپوٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے :

Malthus was wrong. We are not doomed
to breed ourselves into famine.

مالتھس غلطی پر تھا ۔ ہمارے لیے یہ مقدر نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں قحط میں پیدا ہوں ۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مالتھس کی کتاب "اصول آبادی" انسانی ذہن کی پیداوار تھی جو زمان و مکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے ۔ اس کے برعکس قرآن ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جو زمان و مکان سے بلند ہو کر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے ۔ یہی فرق اس بات کا سبب ہے کہ مالتھس کا کلام خارجی حقیقت سے ٹکرا گیا اور قرآن آخری حد تک خارجی حقیقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ قرآن کے بیان اور خارجی واقعہ میں کوئی ٹکراؤ نہیں ۔

کتب مقدسہ کی مثال

۲۔ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں ۲۰ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تیرہویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں گئے۔ یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن میں بھی۔ مگر قرآن کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ جب کہ بائبل میں کئی باتیں ایسی ہیں جو خارجی تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو۔ کیوں کہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو نئی دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) میں اجتماع تھا۔ اس اجتماع کے مقرر مسٹر عذرا کولٹ (Ezra Kolet) تھے جو ہندستان میں آباد یہودیوں کی مجلس (Council of Indian Jewry) کے صدر ہیں۔ تقریر کا عنوان تھا:

(What is Judaism)

یہودی مقرر نے اپنی تقریر میں قدرتی طور پر یہودیوں کی تاریخ بیان کی۔ انہوں نے مصر میں ان کے جانے اور پھر وہاں سے نکلنے کا بھی تذکرہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کا ذکر آیا تو انہوں نے حضرت یوسف کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہا اور حضرت موسیٰ کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون بتایا۔

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "فرعون" نام کے بادشاہ صرف بعد کو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت یوسف کے زمانہ میں دوسرے لوگ مصر کے حکمراں تھے۔

حضرت یوسف جس زمانہ میں مصر میں داخل ہوئے اس زمانہ میں وہاں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرہویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر میں حکمراں رہا۔ اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف

بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کر دی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لیے فرعون کا لقب پسند کیا۔ فرعون کے لفظی معنٰی سورج دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے۔ چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں۔ تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جا سکے۔

مسٹر عذرا کولٹ نے جو کچھ کیا وہ مجبور تھے کہ ویسا ہی کریں۔ کیونکہ بائبل میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ مسٹر عذرا کولٹ یا تو بائبل کو لے سکتے تھے یا تاریخ کو۔ دونوں کو ساتھ لینا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہودی کونسل کا صدر ہونے کی حیثیت سے تاریخ کو چھوڑا اور بائبل کو اختیار کر لیا۔

مگر قرآن اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے۔ اس لیے حاملین قرآن کے لیے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کو لینے کے لیے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد کو زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا۔ اور ان کی بنیاد پر مصر کی تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو قرآن اس کے لیے مَلِکِ مصر (مصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے۔ اس طرح قرآن کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے۔ جب کہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کا مصنّف ایک ایسا مصنف ہے جو انسانی معلومات کے ماورا تمام حقیقتوں کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔

تاریخ کی مثال

۳۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور حیوان دونوں ایک مشترک مورث اعلیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیوانات کی ایک نسل ترقی کرتے کرتے بندر (چمپینزی) تک پہونچی۔ اور بندر کی یہ نسل

مزید ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہاں ہیں۔ یعنی وہ انواع کون سی ہیں جو ابھی ارتقار کے درمیانی سفر میں تھیں اور اس بنا پر ان کے اندر کچھ حیوانی پہلو تھے اور کچھ انسانی پہلو۔ اگرچہ حقیقی طور پر ابھی ایسی کوئی درمیانی نوع دریافت نہیں ہوئی ہے۔ تاہم علمار ارتقار کو یقین ہے کہ ایسی انواع گزری ہیں۔ البتہ ان کا سراغ انہیں ابھی تک نہیں ملا ہے۔ ان مفروضہ کڑیوں کو غلط طور پر گم شدہ کڑیوں (Missing links) کا نام دیا گیا ہے۔

۱۹۱۲ میں لندن کے اخبارات نے پرجوش طور پر یہ خبر دی کہ بندر اور انسان کے درمیان کی ایک گم شدہ کڑی دریافت ہو گئی ہے۔ یہ وہی کڑی ہے جس کو ارتقار کی تاریخ میں پلٹ ڈاؤن انسان (Piltdown man) کہا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ تھی کہ لندن کے برٹش میوزیم کو قدیم زمانہ کا ایک جبڑا ملا جس کا ڈھانچہ بندر جیسا تھا مگر اس کا دانت انسان کے دانت سے مشابہہ تھا۔ اس ہڈی کے ٹکڑے کی بنیاد پر ایک پوری تصویر بنائی گئی جو دیکھنے والوں کو بندر نما انسان یا انسان نما بندر دکھائی دیتی تھی۔ اس کو پلٹ ڈاؤن انسان کا نام دیا گیا۔ کیونکہ وہ پلٹ ڈاؤن نامی مقام سے حاصل ہوا تھا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ باقاعدہ طور پر نصاب کی کتابوں میں شامل کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر آر ایس لل (R.S. Lull) کی کتاب عضویاتی ارتقار (Organic evolution) میں۔ بڑے بڑے علمار و مفکرین نے اس کو جدید انسان کی علمی فتوحات میں شمار کیا۔ مثلاً ایچ جی ویلز (۱۸۶۶-۱۹۴۶) نے اپنی کتاب تاریخ کا خاکہ *(The Outline of History)* میں۔ اور برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) نے اپنی کتاب مغربی فلسفہ کی تاریخ *(A History of Western Philosophy)* میں۔ تاریخ اور حیاتیات کی کتابوں میں پلٹ ڈاؤن انسان کا ذکر اس طرح کیا جانے لگا جیسے کہ وہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔

تقریباً نصف صدی تک جدید علمار اس "عظیم دریافت" سے مسحور رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ میں بعض علمار کو شبہہ ہوا۔ انہوں نے برٹش میوزیم کے آہنی فائر پروف بکس سے مذکورہ جبڑا نکالا۔ اس کو سائنسی طریقے سے جانچا۔ تمام متعلق پہلوؤں سے اس کی تحقیق کی۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر

پہونچے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ایک شخص نے بندر کا ایک جبڑا لیا۔ اس کو مہوگنی رنگ میں رنگا اور پھر اس کے دانت کو ریتی سے گھس کر آدمی کے دانت کی طرح بنایا۔ اس کے بعد اس نے یہ جبڑا یہ کہہ کر برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا کہ یہ اس کو پلٹ ڈاؤن (انگلینڈ) میں ملا ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے چند حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1. *Encylopaedia Britanica* (1984) "Piltdown Man"
2. *Bulletin of the British Museum* (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
3. J.S. Weiner, *The Piltdown Forgery* (1955)
4. Ronald Millar, *The Piltdown Men* (1972)
5. *Readers Digest*, November 1956

فرعون موسیٰ

اس کے مقابلے میں اب قرآن سے اسی نوعیت کی ایک مثال لیجئے۔ یہ فرعون موسیٰ کی مثال ہے۔ اس کے بارہ میں قرآن میں جو الفاظ آئے تھے، بعد کی تاریخ حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق بن گئی۔

تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا جو بادشاہ غرق ہوا وہ رعمسیس دوم کا فرزند تھا۔ اس کا خاندانی لقب فرعون اور ذاتی نام مرنفتاح (Merneptah) تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت اس فرعون کا ذکر صرف بائبل کے مخطوطات میں تھا۔ اس میں بھی صرف یہ لکھا ہوا تھا کہ "خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا اور فرعون کے سارے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا (خروج ۱۴ : ۲۸) اس وقت قرآن نے حیرت انگیز طور پر یہ اعلان کیا کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے اور وہ دنیا والوں کے لیے سبق بنے گا۔

فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ (یونس ۹۲)

آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو۔

قرآن میں جب یہ آیت اتری تو وہ نہایت عجیب تھی۔ اس وقت کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس آیت کے نزول پر اسی حالت میں تقریباً چودہ سو سال گزر گئے۔ پروفیسر لاریٹ (Loret) پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۹۸ میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ یہاں مذکورہ فرعون کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے ۸ جولائی ۱۹۰۷ کو ایلیٹ اسمتھ (Elliot Smith) نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور پھر ۱۹۱۲ میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے شاہی ممیاں (The Royal Mummies) اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ ممی کی ہوئی لاش اسی فرعون کی ہے جو تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانے میں غرق کیا گیا تھا۔ ایک مغربی مفکر کے الفاظ میں :

His earthly remains were saved by the will of God from destruction to become a sign to man, as it is written in the Qur'an.

فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی کے تحت برباد ہونے سے بچا لیا گیا تاکہ وہ انسان کے لیے ایک نشانی ہو، جیسا کہ وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔

قرآن اور بائبل اور سائنس *(The Bible, the Quran, and Science)* کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکائی (Maurice Bucaille) نے ۱۹۷۵ میں فرعون کی اس لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب میں اس پر جو باب لکھا ہے اس کا خاتمہ ان پُر اہتزاز سطروں پر ہوا ہے :

Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo!

وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں، وہاں وہ قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پا لیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں۔

قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا کہ فرعون کا جسم لوگوں کی نشانی کے لیے محفوظ ہے، اور وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں نہایت صحت کے ساتھ برآمد ہو گیا۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علمار سائنس نے اعلان کیا کہ پلٹ ڈاؤن کے مقام پر انھوں نے ایک ڈھانچہ دریافت کیا ہے جو قدیم انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور اگلی معلومات کے تحت وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہو گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہہ باقی رہتا ہے کہ قرآن ایک خدائی کتاب ہے۔ وہ عام انسانی تصنیفات کی طرح کوئی انسانی تصنیف نہیں۔

علم الحیات کی مثال

قدیم زمانہ میں جب کہ موجودہ سائنسی مشاہدات سامنے نہیں آئے تھے، ساری دنیا میں توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بلا تحقیق عجیب عجیب نظریات قائم کر لیے تھے۔ یہ نظریات دوبارہ وقت کی کتابوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ جو شخص بھی اس زمانہ میں کوئی کتاب لکھتا تو ماحول کے زیر اثر وہ ان خیالات کو بھی دہرانے لگتا تھا۔

مثال کے طور پر ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۴ ق م) نے ایک موقع پر پیٹ میں پرورش پانے والے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ وقت کے رواجی فکر کے مطابق یہ کہتا ہے کہ پیٹ کے بچوں کی صحت کا تعلق ہواؤں سے ہے۔ ارسطو کے اس خیال کا مذاق اڑاتے ہوئے برٹرنیڈ رسل نے لکھا ہے:

> He said that children will be healthier if conceived when the wind is in the north. One gathers that the two Mrs Aristotles both had to run out and look at the weathercock every evening before going to bed (p. 17).

ارسطو نے کہا کہ بچے زیادہ تندرست ہوں گے اگر شمالی رخ پر ہوا چلنے کے وقت ان کا حمل قرار پائے ایک شخص اس سے قیاس کر سکتا ہے کہ ارسطو کی دونوں بیویاں ہر شام کو بستر پر جانے سے پہلے دوڑ کر باہر جاتی ہوں گی اور دیکھتی ہوں گی کہ ہوا کا رخ کس سمت میں ہے۔

قرآن اسی قدیم زمانے میں اترا۔ اس میں علم کی مختلف شاخوں سے متعلق کثرت سے حوالے

موجود ہیں۔ مگر قرآن میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں وقت کے رواجی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہو۔

اجسام فلکی کی گردش

قرآن (الانبیاء ۳۳، یٰس ۴۰) میں سورج اور چاند کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں (کل فی فلک یسبحون) ڈاکٹر موریس بوکائی نے ان آیات پر تفصیلی کلام کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہاں فلک سے وہی چیز مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مدار (Orbit) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

> It is shown that the sun moves in an orbit, but no indication is given as to what this orbit might be in relation to the Earth. At the time of the Qur'anic Revelation, it was thought that the Sun moved while the Earth stood still. This was the system of geocentrism that had held sway since the time of Ptolemy, second century B.C., and was to continue to do so untill Copernicus in the sixteenth century A.D. Although people supported this concept at the time of Muhammad, it does not appear anywhere in the Qur'an, either here or elsewhere (p. 159).

مذکورہ آیات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار میں گھومتا ہے۔ مگر اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا ہے کہ زمین کی نسبت سے اس کا مدار کیا ہے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج (زمین کے گرد) گھوم رہا ہے، جب کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ مرکزیت ارضی کا نظام تھا جو دوسری صدی قبل مسیح میں ٹالمی کے زمانہ سے چھایا گیا تھا۔ وہ سولہویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس تک باقی رہا۔ اگرچہ محمدؐ کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کی تائید کرتے تھے مگر قرآن میں وہ کہیں ظاہر نہیں ہوا۔ نہ ان دونوں آیتوں میں اور نہ کسی اور آیت میں۔

جنینی ارتقاء

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال وہ ہے جو ۱۹۸۴ کے آخر میں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کناڈا کے اخبار دی سٹی زن (۲۲ نومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی :

Ancient Holy Book 1300 Years Ahead of its Time

(قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے) اسی طرح نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی:

Kor'an Scores Over Modern Science

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور جنینیات کے ماہر ہیں اور کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے قرآن کی چند آیات (المومنون ۱۴، الزمر ۶) اور جدید تحقیقات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی بار کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی (جدہ) بھی گئے۔ انہوں نے پایا کہ قرآن کا بیان حیرت انگیز طور جدید دریافتوں کے عین مطابق ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہوا کہ قرآن میں کیوں کر وہ حقیقتیں موجود ہیں جن کو مغربی دنیا نے پہلی بار صرف ۱۹۴۰ میں معلوم کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں وہ مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> The 1300 year old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Muslims can reasonably believe them to be revelations from God.

۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقاء کے بارہ میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔

یہ مضمون زیادہ مفصل طور پر ماہنامہ الرسالہ میں شائع کیا گیا ہے۔

نیوٹن کا نظریہ نور

انسان جب بھی کسی مسئلہ پر کلام کرتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ "حال" میں بول رہا ہے۔ اسے "مستقبل" کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی انسان آئندہ ظاہر ہونے والی حقیقتوں کو نہیں جانتا اس لیے وہ اپنے کلام میں ان کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسا معیار ہے جس پر آدمی ہمیشہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر ماضی سے مستقبل تک یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آج کے معلوم واقعات کو بھی جانتا ہے اور ان واقعات کو بھی جو کل انسان کے علم میں آئیں گے۔

مثال کے طور پر نیوٹن (۲۷-۱۷۲۷) نے روشنی کے بارے میں یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشن ذرات ہیں جو اپنے منبع سے نکل کر فضا میں اڑتے ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس کی تاریخ میں روشنی کا ذراتی نظریہ (Corpuscular theory of light) کہا جاتا ہے :

A theory of Optics, in which light is treated as a stream of particles

نیوٹن کے غیر معمولی اثرات کے تحت یہ نظریہ ۱۸۲۰ تک علمی دنیا پر چھایا رہا۔ اس کے بعد اس کو زوال شروع ہوا۔ مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات، خاص طور پر فوٹان (Photons) کے عمل کی دریافت نے روشنی کے ذراتی نظریہ کو ختم کر دیا۔ پروفیسر ینگ (اور دوسرے سائنس دانوں) کی تحقیق نے علماء کو مطمئن کر دیا کہ روشنی بنیادی طور پر موج کی سی خصوصیات رکھتی ہے جو بظاہر نیوٹن کے ذراتی نظریہ کے برعکس ہے :

> Young's work convinced scientists that light has essential wave characteristics in apparent contradiction to Newton's corpuscular (particle) theory.
> *Encyclopaedia Britanica*, 1984, Vol. 19, p. 665

نیوٹن نے اٹھارویں صدی عیسوی میں اپنا نظریہ پیش کیا اور صرف دو سو سال کے اندر وہ غلط ثابت ہو گیا۔ اس کے برعکس قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا پیغام دنیا کے سامنے رکھا۔ اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس کی صداقت آج تک مشتبہ نہیں ہوئی۔ کیا اس کے بعد بھی اس یقین کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے کہ نیوٹن جیسے لوگوں کا کلام محدود انسانی کلام ہوتا ہے اور قرآن لامحدود ذہن سے نکلا ہوا خدائی کلام ہے۔ قرآن کے بیانات کا ابدی طور پر درست ثابت ہونا ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے جو کسی بھی دوسرے کلام کو حاصل نہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور بقیہ تمام کلام انسانی کلام۔

کائنات کا آغاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا (اَوَلَم یرالذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقا

ففتقناهما ، الانبیاء ۳۰)

" رتق " کے معنیٰ ہیں منضم الاجزاء ۔ یعنی کسی چیز کے تمام اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسا ہوا اور سمٹا ہوا ہونا ۔ اور فتق کا لفظ اس کے برعکس عمل کے لیے ہے ۔ یعنی ملے ہوئے اجزاء کو پھاڑ کر الگ الگ کر دینا ۔

یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں اتری ۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کے مختلف اجزاء ابتداءً باہم ملے ہوئے اور سمٹے ہوئے تھے ۔ اس کے بعد خدا نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا تاہم نزولِ قرآن کے بعد صدیوں تک انسان کو معلوم نہ تھا کہ کائنات میں وہ کون سا معاملہ پیش آیا ہے جس کو قرآن نے رتق اور فتق سے تعبیر کیا ہے ۔ پہلی بار اس کی معنویت ۱۹۲۷ میں سامنے آئی جب کہ جارج لیماترے (Georges Lemaitre) نے وہ نظریہ پیش کیا جس کو عام طور پر بگ بینگ (Big bang) کہا جاتا ہے ۔

جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے ۔ چنانچہ موجودہ کائنات کو پھیلتی ہوئی کائنات (Expanding universe) کہا جاتا ہے ۔ اس طرح کے مختلف مشاہدات نے سائنس دانوں کو اس نظریہ تک پہونچایا ہے کہ کائنات ابتداءً سمٹی ہوئی حالت میں تھی ۔ اس وقت وسیع کائنات کے تمام اجزاء نہایت قوت سے باہم جڑے ہوئے تھے ۔ اس ابتدائی مادہ کو کائناتی بیضہ (Cosmic egg) یا سپر ایٹم (Super atom) کہا جاتا ہے ۔

ابتداءً سائنسی حلقہ میں اس کی مخالفت کی گئی ۔ ۱۹۴۸ تک بگ بینگ کے مقابلہ میں اسٹڈی اسٹیٹ نظریہ (Steady-state hypothesis) سائنس دانوں کے یہاں زیادہ قابل توجہ بنا رہا ۔ مگر ۱۹۵۰ سے علم کا وزن بگ بینگ کے حق میں بڑھنے لگا ۔ ۱۹۶۵ میں بیک گراونڈ ریڈیئیشن (Background radiation) کی دریافت نے اس کی مزید تصدیق کی ۔ کیونکہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی انفجار کے ریڈیائی بقایا ہیں جو ابھی تک کائنات کے بعض حصوں میں موجود ہیں ۔ اسی طرح ۱۹۸۱ میں بعض کہکشاؤں کی دریافت جو ہماری زمین سے دس ارب سال نور (Light years) کے فاصلے پر واقع ہیں ، وغیرہ ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

(۱۹۸۴) میں بگ بینگ کے عنوان کے تحت اعتراف کیا گیا ہے کہ اور اب اس نظریہ کو بیشتر علمار کونیات کی تائید حاصل ہے :

and it is now favoured by most cosmologists

یہ واقعہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر میں ماضی سے لے کر مستقبل تک کے تمام حقائق ہیں ۔ وہ چیزوں کو وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں سے انسان نہیں دیکھ سکتا ۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح جان رہا ہوتا ہے جب کہ دوسروں کو کوئی علم نہیں ہوتا ۔

شہد کی طبّی اہمیت

قران میں شہد کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر شفا ہے (فیہ شفاء للناس ، النحل ۶۹) مسلمانوں نے اس آیت کی روشنی میں شہد کے طبی پہلو پر بہت زور دیا ۔ مسلمانوں کے یہاں دواسازی کے فن میں شہد کو خصوصی درجہ حاصل رہا ہے ۔ مگر مغربی دنیا صدیوں تک اس کی طبی اہمیت سے بے خبر رہی ۔ یورپ میں ابھی انیسویں صدی تک شہد کو بس ایک رقیق غذا (Liquid food) کی حیثیت حاصل تھی ۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپ کے علمار نے یہ دریافت کیا کہ شہد کے اندر دافع عفونت خصوصیات (Antiseptic properties) موجود ہیں ۔

اس سلسلے میں ہم جدید تحقیقات کا خلاصہ ایک امریکی میگزین سے نقل کرتے ہیں :

Honey is a powerful destroyer of germs which produce human diseases. It was not untill the twentieth century, however, that this was demonstrated scientifically. Dr. W.G. Sackett, formerly with the Colorado Agricultural College at Fort Collins, attempted to prove that honey was a carrier of disease much like milk. To his surprise, all the disease germs he introduced into pure honey were quickly destroyed. The germ that causes typhoid fever died in pure honey after 48 hours' exposure. Enteritidis, causing intestinal inflation, lived 48 hours. A hardy germ which causes broncho-pheumonia and septicemia held out for four days. Bacillus coli Communis which under certain conditions causes peritonitis, was dead on the fifth day of experiment. According to Dr. Bodog Beck, there are many other germs equally destructible in honey. The reason for this bactericidal quality in honey, he said, is in its hygroscopic ability. It literally draws every particle of moisture out of germs. Germs, like any other living organism, perish without water. This power to absorb moisture is almost unlimited. Honey will draw moisture from metal, glass, and even stone rocks.

Rosicrucian Digest, September 1975 p. 11

شہد جراثیم کو مار ڈالنے والی چیز ہے جو کہ انسانی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی سے پہلے تک اس کو علمی طور پر دکھایا نہیں جا سکا تھا۔ ڈاکٹر ساکٹ جو اس سے پہلے فورٹ کولنس کے ایگریکلچرل کالج سے وابستہ تھے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہد کے اندر بیماری کے جراثیم پرورش پاتے ہیں جس طرح وہ دودھ میں پرورش پاتے ہیں۔ مگر ان کو سخت تعجب ہوا جب تجربات کے دوران انہوں نے پایا کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم جو انہوں نے خالص شہد کے اندر ڈالے تھے وہ سب کے سب بہت جلد مر گئے۔ میعادی بخار کے جراثیم صرف ۴۸ گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گئے۔ بعض سخت جاں جراثیم چار دن یا پانچ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر بوڈوگ بک نے بتایا ہے کہ شہد کے اندر جراثیم کو مارنے کی اس خصوصیت کی سادہ سی وجہ ہے وہ شہد کی رطوبت کو چوس لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شہد جراثیم کی رطوبت کا ہر جزء کھینچ لیتی ہے۔ جراثیم دوسرے حیوانات کی طرح پانی کے بغیر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شہد کے اندر پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت لامحدود مقدار میں ہے۔ وہ دھات، شیشہ اور پتھر تک سے رطوبت کھینچ لیتی ہے۔

قرآن کی برتری

عربی زبان تمام زبانوں کے درمیان ایک حیران کن استثنار رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جافرے چاسر (۱۴۰۰ - ۱۳۴۲) اور ویلیم شیکسپیر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) انگریزی زبان کے شاعر اور ادیب تھے۔ مگر آج کا ایک عام انگریزی داں ان کو پڑھنا چاہے تو اس کو انہیں ترجمہ کر کے پڑھنا پڑے گا۔ چاسر اور شیکسپیر کا کلام جدید انگریزی نصاب میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا ہے تقریباً ویسے ہی جیسے غیر زبان کی کتابیں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی ہیں

مگر عربی زبان کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی ہے۔ اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے۔ مگر یہ ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنی کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا۔

جس طرح چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت میں قیامت تک باقی رہے۔ یہ کتاب کبھی "کلاسیکل لٹریچر" کی الماری میں نہ جانے پائے وہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان پڑھی اور سمجھی جاتی رہے۔

یہی معاملہ علوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے علوم کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ علوم کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے تاکہ قرآن نے کسی معاملہ میں جو کچھ کہدیا ہے وہی ہمیشہ حرف آخر کی حیثیت سے باقی رہے۔ چنانچہ بے شمار علمی ترقیوں کے باوجود علوم بالآخر وہیں باقی رہتے ہیں یا وہیں لوٹ آتے ہیں جہاں قرآن نے اوّل دن ان کو رکھ دیا تھا۔

ایک طرف انسانی کلام کی مثال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جب کہ قرآن انتہائی بڑے اور گہرے معاملات میں بھی اپنی برتر صداقت کو قائم کیے ہوئے ہے۔ یہاں میں ایک تقابلی مثال دوں گا۔

ارسطو نے اپنے تصوراتی معاشرہ میں عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ ہے کہ عورت کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے اپنی کتاب 'سماج پر سائنس کے اثرات' (The Impact of Science On Society) میں ارسطو کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے:

> Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occured to him to verify this statement by examining his wive's mouths (p. 17).

ارسطو نے دعوی کیا کہ عورتوں کے یہاں مردوں سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی دو بار شادی ہوئی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کے منہ کو جانچ کر اس بیان کی تصدیق کرتا۔ ارسطو کا بیان حقیقت واقعہ پر حادی نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس قرآن کے بیانات حقیقت واقعہ کا اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہیں کہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں جاتے۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا اس کائنات کا حاکم مطلق ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے اسے چلاتا ہے (فعال لما یرید، یفعل اللہ ما یشاء) پچھلے ہزاروں سال سے خدا کا یہ تصور تسلیم شدہ چلا آرہا تھا۔ انسان اس کو بلا بحث مانے ہوئے تھا۔

مگر موجودہ زمانے میں علم کی ترقی ہوئی تو انسان نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ واقعات کے پیچھے معلوم مادی اسباب کے سوا اور کوئی طاقت نہیں۔ تمام واقعات مادی اسباب وعلل کے تحت وقوع میں آتے ہیں۔ اور مادی قوانین کے تحت ان کی کامل توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ مگر بعد کی علمی تحقیقات نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اب علم دوبارہ وہیں آگیا جہاں وہ ابتداء میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اصول تعلیل کی موت

کہا جاتا ہے کہ نیوٹن (۱۷۲۷ - ۱۶۴۲) اپنے باغ میں تھا۔ اس نے سیب کے ایک درخت سے سیب کا پھل گرتے ہوئے دیکھا۔ "سیب کا پھل شاخ سے الگ ہو کر نیچے کیوں گرا۔ وہ اوپر کیوں نہیں چلا گیا" اس نے سوچا۔ اس سوال نے آخر کار اس کو یہاں تک پہونچایا کہ زمین میں قوت کشش ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھل درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، وہ اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

مگر یہ آدھی حقیقت تھی۔ نیوٹن کو سوچنا چاہیے تھا کہ درخت کا پھل اگر اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اسی درخت کا تنہ نیچے سے اوپر کی طرف کیوں جاتا ہے۔ ایک ہی درخت ہے، اس کی جڑیں زمین کے نیچے کی طرف جارہی ہیں۔ اس کا پھل ٹوٹتا ہے تو وہ گر کر نیچے آجاتا ہے۔ مگر اسی درخت کا تنہ اور اس کی شاخیں زمین سے اٹھ کر اوپر کی طرف چلی جارہی ہیں۔

درخت کا یہ دوگونہ پہلو نیوٹن کے مفروضہ کی نفی کر رہا تھا۔ تاہم اس نے معاملہ کے ایک پہلو کو چھوڑ کر اس کے دوسرے پہلو کو لے لیا۔ پھر اسی کی روشنی میں اس نے خلا میں پھیلے ہوئے شمسی نظام کے اصول مرتب کیے۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ تمام اجرام میں ایک خاص تناسب سے قوتِ کشش موجود ہوتی ہے۔ یہی کشش سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں کو

سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو نہایت صحت کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔

یہ طرز فکر مزید آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ آئن سٹائن (۱۹۵۵-۱۸۷۹) نے اپنے نظریۂ اضافیت کے تحت اس کو مزید مؤکد کیا۔ آئن سٹائن کی تحقیق اگرچہ نیوٹن کے تمام نظریات کی تصدیق نہیں کرتی۔ تاہم نظام شمسی کے سلسلے میں اس کے نظریہ کی بنیاد کشش ثقل کے اصول پر ہی قائم ہے:

Einstein's theory of relativity declares that gravity controls the behaviour of planets, stars, galaxies and the universe itself and does it in a predictable manner.

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشش ثقل سیاروں، ستاروں، کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

اس سائنسی دریافت کو ہیوم (۱۷۷۶-۱۷۱۱) اور دوسرے مفکرین نے فلسفہ بنایا۔ انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصول تعلیل (Principle of causation) پر چل رہا ہے۔ جب تک اسباب وعلل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھتا رہا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والا ایک خدا ہے۔ مگر اب ہم کو اسباب وعلل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (Causation) کا مادی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے نہ کہ کوئی مفروضہ خدا۔

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضہ کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے اور وہ مذکورہ اصول تعلیل کی کامل تردید ہے:

The quantum mechanics theory maintains that, at the atomic level, matter behaves randomly.

کوانٹم میکینکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹم کی سطح پر مادہ غیر مرتب انداز میں عمل کرتا ہے۔

سائنس میں کسی " اصول " کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا ہو تو علمی طور پر اس کا مسلّمہ اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں کرتا جس کا مشاہدہ نظام شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔

آئن سٹائن کو یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس طرح کائنات مادی کرشمے کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پا رہی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع کی۔ اپنی زندگی کے آخری ۳۰ سال اس نے اس کوشش میں صرف کر دیے کہ نظام فطرت میں اس "تضاد" کو ختم کرے۔ شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کے عمل کو ایک قانون کے تحت منظم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا:

Einstein spent the last 30 years of his life trying to reconcile these seeming contradictions of nature. He rejected the randomness of quantum mechanics. "I cannot believe that God plays dice with the cosmos," he said.

آئن سٹائن نے اپنی آخری زندگی کے ۳۰ سال اس پر صرف کیے کہ فطرت کے اس بظاہر متضاد اصول کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے۔ اس نے کوانٹم نظریہ کی بے ترتیبی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ خدا کائنات کے ساتھ جوا کھیل رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح پر حرکت کا مطالعہ کر کے انسان نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی کہ اس کی حرکت معلوم مادی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ با اختیار خدا کے قرآنی تصور کی گویا تردید تھی۔ مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آ گئی۔ بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرات کی حرکت کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں ہے۔

ایک سائنس داں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے :

The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? (Ian Roxburg)

طبیعیات کے قوانین جو زمین پر دریافت کیے گیے ہیں وہ تحکمی گنتیوں پر مشتمل ہیں ، جیسے الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے ۔ کیوں ۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انہیں گنتیوں کا انتخاب کر رکھا ہے ۔
(سنڈے ٹائمس ، لندن ، ۴ دسمبر ۱۹۷۷ء)

یہ الفاظ سائنس کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہیں کہ کائنات انسانی علم کے احاطہ میں نہیں آتی ۔ کائنات ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کا ظہور ہے ۔ اور خدا کی مرضی کے تصور کے تحت ہی اس کی واقعی توجیہہ کی جا سکتی ہے ۔

یہ مقالہ قرآنی سیمنار (لاہور) میں ۲۶ مارچ ۱۹۸۵ کو پڑھ کر سنایا گیا ۔

قرآن خدا کی آواز

کائنات ایک راز ہے اور جو کتاب اس راز کو کھولتی ہے وہ قرآن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کتاب الٰہی کے بغیر کوئی شخص حیات و کائنات کے معمے کو حل نہیں کرسکتا۔ میں نے حال میں کسی قدر تفصیل سے ساتھ مارکسزم کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ مارکس غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی تھا ایسا کہ اس جیسی صلاحیت کے بہت کم انسان تاریخ میں پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس نے ایسی احمقانہ باتیں کہیں ہیں کہ تاریخ میں اس کے جیسی احمقانہ باتیں بہت کم لوگوں نے کی ہوں گی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس کو علم کا وہ سرا نہیں ملا تھا جس کے بغیر زندگی کے معاملات میں کوئی صحیح اور قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

ایک دوا جو کسی کارخانے سے بن کر نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی ترکیبِ استعمال کا پُرزہ بھی رکھ دیا جاتا ہے، جس میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ دوا کس مرض کے لیے ہے، کن اجزا سے مل کر بنی ہے اور کس طرح اسے استعمال کرنا چاہیئے، مگر آدمی اس حال میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح اسے دنیا میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کوئی صحیفہ لے کر نہیں آتا اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا ہے جہاں ان سوالات کا جواب لکھ کر رکھدیا گیا ہو، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصل حقیقت سے بے خبر ہوکر اپنے اور زمین و آسمان کے بارے میں عجیب عجیب رائے قائم کرنے لگتا ہے، وہ اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو وہ اسے ذہنی اور جسمانی قوتوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ نظر آتا ہے۔ جس کے بنانے میں اس کے اپنے ارادہ عمل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پھر اپنے وجود سے باہر کی دنیا پر نظر کرتا ہے تو اسے ایک نہایت وسیع پھیلی ہوئی کائنات ملتی ہے۔ جس کا وہ احاطہ نہیں کرسکتا۔ جس کو وہ پار نہیں کرسکتا۔ جس کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو

وہ شمار نہیں کر سکتا۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے ؟ یہ دنیا کہاں سے شروع ہوئی ہے اور کہاں جا کر ختم ہو گی ؟ اس تمام ہست و بود کا مقصد کیا ہے ؟ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں کے بارے میں بالکل ناواقف پاتا ہے۔ انسان کو آنکھ دی گئی ہے مگر وہ آنکھ ایسی ہے جو کسی چیز کے صرف ظاہر کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے پاس عقل ہے مگر عقل کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اسے خود اپنی خبر نہیں۔ آج تک انسان یہ معلوم نہ کر سکا کہ ذہن انسانی میں خیالات کیوں کر پیدا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح سوچتا ہے۔ ایسی حقیر صلاحیتوں کے ساتھ وہ نہ تو اپنے بارے میں کسی صحیح نتیجہ تک پہونچ سکتا اور نہ کائنات کو سمجھ سکتا ہے۔

اس معمے کو خدا کی کتاب حل کرتی ہے۔ اس آسمان کے نیچے آج قرآن ہی ایک ایسا صحیفہ ہے جو پورے یقین کے ساتھ تمام حقیقتوں کے بارے میں ہم کو قطعی علم بخشتا ہے۔ جن لوگوں نے کتاب الٰہی کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے اندھوں کے پاس ایک ہاتھی کھڑا کر دیا جائے اور پھر ان سے پوچھا جائے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ تو جس کا ہاتھ اس کی دُم پر پڑے گا وہ کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے مورچھل۔ کوئی کان ٹٹول کر کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ۔ کوئی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے گا اور کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت۔ کوئی پاؤں چھو کر کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا۔ تمام بے خدا فلسفیوں اور مفکروں کا یہی حال ہے۔ انہوں نے کائنات کے اندر حقیقت کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر علم کی روشنی سے چونکہ وہ محروم تھے اس لیے ان کی تمام کوششوں کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہ نکلا جیسے کوئی شخص اندھیرے میں بھٹک رہا ہو اور اٹکل کے ذریعے الٹے سیدھے فیصلے کرتا رہے۔

دنیا میں ایسے لوگ گزرے ہیں جو ساری زندگی حقیقت کی تلاش میں رہے مگر حقیقت کو نہ پا کر خودکشی کر لی اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو حقیقت تو نہیں ملی، مگر صرف اٹکل سے انہوں نے ایک فلسفہ گھڑ لیا۔ میرے نزدیک ان دو قسم کے انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ ایک نے اپنی اٹکل کو عقل سمجھا اور اس کو مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا، اور دوسرے کو اپنی اٹکل پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور اس نے عاجز آکر اس حیرت کدۂ عالم سے نکل جانے کی کوشش کی اور خود اپنا گلا گھونٹ ڈالا۔ حقیقی علم سے یہ بھی محروم تھے اور وہ بھی۔ رازِ حیات کا جو اصل رازداں ہے اس کی مدد کے بغیر کوئی شخص اس راز کو سمجھ نہیں سکتا۔ یقیناً انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ مگر اس کی

مثال بالکل ایسی ہے جیسے آنکھ۔ یقیناً اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہے، مگر کیا خارجی روشنی کے بغیر کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے؟ رات کے وقت ایک اندھیرے کمرے میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی آپ کو کچھ سجھائی نہیں دیتا مگر جب بجلی کا بلب روشن کر دیا جائے تو ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح وحئ الٰہی عقل کی روشنی ہے۔ اس روشنی کے بغیر ہم اشیاء کی حقیقت کو نہیں پا سکتے۔

ایک صاحب سے ایک مرتبہ میری گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا "یہ بات کہی جاتی ہے کہ علم اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی بہت سی کتابیں پڑھے ہوئے ہو اور مدرسوں اور کالجوں کی ڈگری اپنے پاس رکھتا ہو۔ سب سے بڑا علم ایمان ہے۔ قرآن میں بھی آیا ہے کہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ہی حقیقت میں عالم ہیں۔ مگر یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا کارل مارکس جسے معاش کا پیغمبر کہا جاتا ہے، اس کو لیجئے اس کو وہ علمِ صحیح حاصل نہیں تھا جو خدا کے فضل سے آج آپ کو حاصل ہے۔ اس کے سامنے دنیا کی یہ صورتِ حال آئی کہ کچھ لوگ جاگیر دار اور کارخانہ دار بن کر دولت کے بڑے حصہ پر قابض ہوگئے ہیں اور بیشتر لوگ نہایت مفلسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس اونچ نیچ کی اصل جڑ موجود ملکیتی نظام ہے جس میں چیزیں استعمال کے لیے نہیں بنتیں، بلکہ اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دوسرے انسانوں کے ہاتھ بیچ کر ان سے نفع کمایا جائے۔ اس کی وجہ سے افراد کو موقع ملتا ہے کہ اپنی ملکیت بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے دوسروں کو لوٹیں۔ اس کا علاج اس نے یہ تجویز کیا کہ ملکیت کے حقوق سرے سے ختم کر کے دولت حاصل کرنے کے ذرائع کو عوام کے مشترکہ قبضہ میں دے دیا جائے اور حکومت کے ذمہ یہ کام سپرد کیا جائے کہ وہ سب کے مفاد کے مطابق دولت کی پیدائش اور تقسیم کا اجتماعی انتظام کرے۔

سوال یہ ہوا کہ ایسی صورت میں تمام چیزوں پر حکومت کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور جب آج کچھ لوگ سرمایہ دار بننے کے ذرائع اپنے ہاتھ میں پاکر نفع اندوزی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو دوسرے کچھ لوگ جن کے سپرد یہ خزانہ کیا جائے گا کیا وہ بھی ایسا ہی نہیں کریں گے جب کہ دولت حاصل کرنے کے ذرائع کے ساتھ ان نئے منتظمین کو فوج اور قانون سازی کی طاقتیں بھی حاصل ہوں گی۔ کارل مارکس نے جواب دیا کہ "حرص اور لوٹ اصل میں ملکیتی نظام کی پیداوار ہے۔ اشتراکی سماج میں اس قسم کی چیزیں ختم ہو جائیں گی"۔ میں نے صاحب موصوف سے پوچھا اب آپ بتائیے کیا مارکس کا یہ خیال صحیح تھا۔ انہوں نے کہا ہرگز

نہیں، آخرت کی باز پرس کے سوا دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو ظلم اور خود غرضی سے پاک کر سکے۔ میں نے کہا پھر علم والا کون ہوا، آپ یا کارل مارکس؟ جس کے خود ساختہ نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانیت پہلے سے بھی زیادہ ظلم وستم کا شکار ہو رہی ہے۔ کیونکہ زار اور سرمایہ دار پہلے دو الگ الگ وجود تھے اور اب اشتراکی نظام میں جو زار ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

تقریباً یہی کیفیت ان تمام فلسفیوں کی ہے جنہوں نے خدا کے بغیر کائنات کا معاملہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیالات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ گویا اندھوں کے مجمع میں ایک ہاتھی ہے جس کو کوئی مورچھل بتاتا ہے، کوئی سوپ، کوئی تخت کہتا ہے اور کوئی کھمبا۔ اگر کتاب الٰہی کی روشنی میں زندگی اور کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو ہر چیز بالکل صاف صاف اپنی اصلی شکل میں نظر آنے لگتی ہے اور ایک معمولی آدمی کو بھی اشیاء کی حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی وہ پہلی نظر میں اصل حقیقت تک پہونچ جاتا ہے۔ مگر جو اس علم سے محروم ہے اس کے لیے یہ دنیا ایک بھول بھلیاں ہے جس میں وہ بھٹک رہا ہے۔

انسانی علوم ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں، مگر زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ "کائنات کیا ہے" مگر اس کے بارے میں وہ اب تک ایک حرف نہ بتا سکے کہ "جو کچھ ہے وہ کیوں ہے"، چند گیسیں، چند دھاتیں اور چند نمکیات کے ملنے سے ایک چلتا پھرتا باشعور انسان وجود میں آتا ہے، مٹی میں بیج ڈال دینے سے ہرے بھرے پھل دار درخت اور پودے نکلتے ہیں۔
محض ایٹم کی تعداد بدل جانے سے بے شمار عناصر بن جاتے ہیں۔ دو گیسوں کے ملنے سے پانی جیسی قیمتی چیز تیار ہو جاتی ہے۔ پانی کے لیے سالمات کی حرکت (Molecular motion) سے بھاپ کی طاقت پیدا ہوتی ہے جو دیو پیکر انجنوں کو حرکت دیتی ہے۔ ایٹم کے حقیر برقیے جو کسی خوردبین کے ذریعہ دیکھے نہیں جا سکتے، ان کے انتشار سے وہ بے پناہ طاقت پیدا ہوتی ہے جو پہاڑوں کو توڑ ڈالتی ہے۔ "یہ سب ہوتا ہے" بس ہم ان چیزوں کے بارے میں اسی قدر جانتے ہیں۔ مگر "یہ سب کیوں ہو رہا ہے" ان کے بارے میں انسانی علوم ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔

"دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرّے ہیں۔ شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے ان میں کچھ ایسے ستارے ہیں جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جاسکتی ہیں اور پھر بھی جگہ بچ رہے گی، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں۔ یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے۔ پھر یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کرور سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کرسکتا۔ وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا" [1]

انسانی مطالعہ ہم کو اس حیرت انگیز کائنات کے سامنے لاکر چھوڑ دیتا ہے، وہ ہم کو نہیں بتاتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، کون ان واقعات کو وجود میں لا رہا ہے اور وہ کون سا ہاتھ ہے جو خلائے بسیط میں عظیم الشان کروں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ تمام باتیں ہم کو قرآن سے ملتی ہیں۔ قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اشیاء کیونکر وجود میں آئی ہیں، وہ کس طرح قائم ہیں اور مستقبل میں ان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کائنات کے خالق اور مالک کا ہم سے تعارف کراتا ہے، اور اس کی کارفرمائیوں کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے

قرآن سلطنتِ الٰہی کا لفظی مشاہدہ ہے۔ ایک چھپا ہوا طاقت ور ارادہ جو اس کائنات میں ہر طرف کام کر رہا ہے، قرآن کے صفحات میں وہ ہم کو بالکل محسوس طور پر نظر آتا ہے۔ وہ مابعد الطبیعی

---

[1] یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ ہے مگر یہ صرف ایک "ریاضی داں کا قیاس" ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک انسان کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

حقیقتیں جن کو آدمی سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کر سکتا، یہ کتاب ان کے بارے میں ہمیں قطعی خبر دیتی ہے۔ اور صرف خبر نہیں دیتی بلکہ لفظوں کے ذریعے اتنے حیرت انگیز طریقہ پر ان کا مرقعہ کھینچتی ہے کہ غیب بالکل شہود معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ کتاب ہم کو صرف یہی نہیں بتاتی کہ "خدا ہے"، بلکہ وہ حیرت انگیز طور پر ایک مدبر کائنات کا زندہ تصور سامنے لاکر رکھ دیتی ہے وہ آخرت کے بارے میں صرف اطلاع نہیں دیتی بلکہ اس ہولناک دن کی اتنی کامیاب منظر کشی کرتی ہے کہ آنے والا دن بالکل نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ مشہور ہے کہ یونان میں ایک مصور نے انگور کے خوشہ کی تصویر بنائی۔ یہ تصویر اتنی کامیاب تھی کہ چڑیاں اس پر چونچ مارتی تھیں، یہ ایک انسان کا آرٹ تھا۔ پھر قرآن تو خالق کائنات کا آرٹ ہے اس کے کمال فن کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

قرآن مجید پہلا فقرہ ہے، الحمد للہ رب العالمین یہ فقرہ نہایت بامعنیٰ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں: "شکر ہے اس خدا کا جو تمام دنیا والوں کا مالک و مربی ہے"۔ مالک و مربی اس کو کہتے ہیں جو اپنے ماتحتوں پر گہری نظر رکھے، اور ان کی تمام ضروریات کا سامان فراہم کرے۔ انسان کی ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کو بتایا جائے وہ کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا، اس کا فائدہ کس چیز میں ہے اور نقصان کس چیز میں۔ آدمی کو اگر کسی ایسے آسمانی کرہ میں لے جاکر ڈال دیا جائے جہاں ہوا اور پانی کا وجود نہ ہو تو یہ اس کے لیے اتنا بڑا حادثہ نہ ہوگا جتنا بڑا حادثہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو اس حال میں پائے کہ اپنے اور ماحول کے بارے میں وہ صحیح علم سے بے خبر ہے۔

اللہ اپنی مخلوق پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا باپ اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے بندوں کی اس محتاجی کو دیکھتا اور اسے پورا نہ کرتا۔ چنانچہ اس نے وحی کے ذریعے وہ ضروری علم بھیجا جو انسان کو اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے درکار تھا، اور ایک انسانی زبان جس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ یہ خالق کا اپنے بندوں پر سب سے بڑا احسان ہے، جو بندہ اپنی حیثیت کو پہچانتا ہو اور جس کو یہ احساس ہو کہ وہ حقیقت کا علم جاننے کے لیے اپنے خالق کا کس قدر محتاج ہے، اس کا دل خدا کی اس عنایت کو دیکھ کر شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا اور اس کتاب کو پاکر وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا 'الحمد للہ رب العالمین۔ یہ بندہ کی زبان سے ادا ہونے والا کلمہ ہے جو خدا کی طرف سے القا کیا گیا ہے۔ بندہ یہ جاننے کے لیے بھی کہ وہ کس طرح اپنے آقا کی بندگی کرے، آقا کی رہنمائی کا محتاج ہے، آدمی کے اندر فطری طور پر بندگی کے جذبات

امنڈتے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ ان جذبات کو کس طرح ظاہر کرے ــ قرآن انہیں متعین کرتا ہے اور ان کے لیے الفاظ مہیا کرتا ہے ۔ قرآن کی دعائیں اس سلسلہ میں بہترین عطیہ ہیں ۔

قرآن معروف معنوں میں کوئی کتاب نہیں ، زیادہ صحیح معنوں میں وہ دعوتِ اسلامی کی آخری جدوجہد کی سرگزشت ہے ۔ اللہ تعالےٰ قدیم ترین زمانہ سے انسانوں کے لیے حقیقت کا علم اپنے خاص بندوں کے ذریعہ بھیجتا رہا ہے ۔ ساتویں صدی عیسوی میں اللہ تعالےٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ روئے زمین پر بسنے والوں کے لیے آخری طور پر حقیقت کا علم دے دے ۔ اور اس علم کی بنیاد پر ایک باقاعدہ سوسائٹی کی تعمیر بھی کر دے تاکہ وہ قیامت تک تمام نسل انسانی کے لیے روشنی اور نمونہ کا کام دے سکے ۔

اسی مقصد کے تحت اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث فرمایا اور آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی کہ آپ عرب میں اس پیغام حق کی اشاعت کریں اور پھر جو لوگ آپ کے اس پیغام سے متاثر ہوں ان کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ تمام دنیا میں اس پیغام کو پھیلائیں ۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس علمِ حق کو پھیلانے اور اس کی بنیاد پر ایک انسانی معاشرہ قائم کرنے کی جو تحریک عرب میں پھیلائی اس کو ہدایت دینے والا خود اللہ تعالےٰ تھا ۔ اس نے اپنے براہِ راست کلام کے ذریعے پیغمبر پر وحی کہ اسے کن چیزوں کی تبلیغ کرنی ہے ۔ اس نے وہ تمام دلائل فراہم کیے جو اس پیغام کو موثر بنانے کے لیے ضروری تھے ۔ جب مخالفین کی طرف سے کوئی اعتراض اٹھا تو اس نے جواب دیا ۔ جب اس دعوت کو قبول کرنے والوں میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اس کی اصلاح کی ۔

اس نے جنگ وصلح کے احکام دیئے اور تعلیم وتربیت کے قاعدے بتائے ۔ اس نے شدائد کے وقت اپنے پیروؤں کو تسلی دی اور غلبہ کے وقت وہ قانونی احکام دیئے جن کی بنیاد پر نئے معاشرہ کی تعمیر کرنی تھی ۔ غرض یہ تحریک جس کی ابتدا اور انتہا کے درمیان ۲۳ سال کا فاصلہ ہے ۔ اس کے تمام مراحل میں اللہ تعالےٰ ایک کلی رہنما کی حیثیت سے ہدایات واحکامات بھیجتا رہا ۔ یہی احکام وہدایات بعد کو خود رہنما کے منشا کے مطابق ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیئے گئے اور اسی مجموعہ کا نام قرآن ہے ۔

وہ دعوتِ حق جو آخری نبی کے ذریعے عرب میں اٹھی اور جس کی رہنمائی خود اللہ تعالےٰ نے فرمائی قرآن اس کا معتبر ترین ریکارڈ ہے ۔ یہ ان خدائی ہدایات کا مجموعہ ہے جو اس تحریک کی رہنمائی کے

لیے تقریباً ایک چوتھائی صدی کے درمیان مختلف اوقات میں بھیجے گیے تھے، مگر یہ قرآن صرف تاریخ نہیں ہے، وہ خدا کا مستقل فرمان ہے جو تاریخ کے سانچے میں ڈھال کر ہمیں دیا گیا ہے۔ وہ تاریخ ہے اس لیے کہ وہ ایک عملی نمونہ ہے اور عملی نصیحت کے لیے مہیا کیا گیا ہے، وہ مستقل فرمان ہے اس لیے کہ مالک کائنات کے فیصلہ کے مطابق اسی کی بنیاد پر ہر دور کے انسان کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

مگر اس خاص ترتیب کے باوجود قرآن اس قسم کے مجموعوں سے بالکل مختلف ہے۔ جیسے آج کل سیاسی لیڈروں کی تقریروں کے مجموعے چھپتے ہیں۔ یہ عالم الغیب کی ایک باکمال منصوبہ بندی ہے۔ قرآن کے مختلف اجزاء ایک طویل زمانے میں الگ الگ بھیجے گیے، مگر یہ مختلف ٹکڑے محض اتفاق کے طور پر وجود میں نہیں آگئے تھے، بلکہ وہ ایک مرتب اسکیم کے اجزا رہتے جو عملی ضرورت کے تحت مختلف اوقات میں مختلف ترتیب کے ساتھ نازل ہوئے۔ اسکیم کے اختتام پر جب انہیں مکمل کر کے جوڑ دیا گیا تو اب وہ ایک لاجواب وحدت بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ہندستان کے لیے ایک نو تعمیر کارخانہ کا سامان سمندر کے پار کسی ملک میں تیار کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سامان وہاں کے مختلف کارخانوں میں الگ الگ بنے گا اور تمام سامان الگ الگ جہازوں میں بھر کر ہندوستان روانہ کر دیا جائے گا۔ بہ ظاہر دیکھیے تو تیاری کے پورے مرحلے میں یہ کارخانہ متفرق اور نامکمل چیزوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے مگر یہ سامان جو مختلف جہازوں پر لد کر آیا ہے جب یہاں اس کے تمام حصوں کو جوڑ دیا جاتا ہے تو ایک پورا کارخانہ ہماری نظروں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تقریباً یہی معاملہ قرآن کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ مستقل اور مکمل دستور حیات ہے اس لیے وہ ایک وحدت ہے۔ وہ مخالف ماحول کا مقابلہ کر کے اس کو موافق بنانے کا پیغام ہے اس لیے حالات و ضروریات کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے وہ منفرق احکام کا مجموعہ ہے مگر خدائے عزیز و حکیم کی منصوبہ بندی نے اس کو ایک نہایت مرتب اور مکمل وحدت بنا دیا ہے۔

آج دنیا میں اربوں اور کھربوں کی تعداد میں کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ ایک ایک فن اور ہر فن کے مختلف شعبوں پر اتنی کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں کہ آدمی ساری عمر ان کا مطالعہ کرتا رہے، مگر قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ دنیا میں تمام کتابوں کا مطالعہ بھی آدمی کو اس سے بے نیاز

نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری کتابوں کے مطالعہ سے کوئی شخص صحیح معنوں میں اسی وقت مستفید ہوسکتا ہے، جب اسے قرآن کے ذریعہ وہ بصیرت حاصل ہوچکی ہو جو ہر معاملہ میں فیصلہ تک پہونچنے کے لیے ضروری ہے۔ بحری جہازوں کے لیے ناپیدا کنار سمندر میں قطب نما کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں صحیح رائے پر پہونچنے کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہے، جو اس روشنی سے بہرہ مند ہوگا وہ ہر گہرائی سے اپنی زندگی کی کشتی پار اتارے گا اور جو اس روشنی سے محروم ہوگا وہ زندگی کے مسائل میں الجھ کر رہ جائے گا اور کسی صحیح نتیجہ تک نہ پہونچ سکے گا۔

قرآن فطرت کے اس خلا کو پُر کرتا ہے جس نے تاریخ کے ہر دور میں انسان کو بے چین رکھا ہے۔ روسو نے کہا تھا کہ:

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر میں ہر طرف اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہوں"

میں کہوں گا کہ انسان فطرۃً بندہ پیدا ہوا ہے، مگر وہ مصنوعی طور پر آقا بننا چاہتا ہے۔ انسان بظاہر ایک مکمل وجود معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ سراپا احتیاج ہے۔ جس طرح اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہوا، پانی اور دوسری زمینی پیداوار کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کو ذہنی زندگی کے لیے بھی ایک خارجی سہارے کی ضرورت ہے۔ انسان فطرۃً ایک ایسا سہارا چاہتا ہے جس پر وہ مشکل حالات میں اعتماد کرسکے، اس کو ایک ایسی قریبی ہستی کی ضرورت ہے جس کے آگے وہ اپنا سر جھکا دے۔ جب وہ تکلیف میں ہو تو کسی حاجت روا کے سامنے ہاتھ اٹھا سکے۔ جب اسے خوشی ہو تو کسی محسن کے سامنے سجدۂ شکر بجالائے۔ جس طرح سمندر میں ڈوبنے والا ایک شخص کشتی کا سہارا چاہتا ہے اسی طرح اس وسیع وعریض کائنات میں انسان کو ایک مضبوط رسّی کی ضرورت ہے جسے وہ تھام سکے۔ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت اس کمی سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ خلا ذاتِ خداوندی کے ذریعہ پُر کیا جائے تو یہ توحید ہے اور اگر اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کا سہارا ڈھونڈا جائے تو یہ شرک ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں انسان ان دو میں سے کسی نہ کسی سہارے کو اختیار کرنے پر مجبور رہا ہے۔ جو لوگ توحید کے پرستار ہیں ان کا سہارا قدیم ترین زمانہ سے ایک خدا تھا۔ اور اب بھی صرف خدا ہے، مگر شرک کے پرستاروں کے قبلے بدلتے رہے ہیں۔ پہلے زمانہ کا انسان اور موجودہ دور

میں بھی بہت سے لوگ فضا کے روشن ستاروں سے لے کر درخت اور پتھر تک بے شمار چیزوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اور اب موجودہ زمانہ میں قوم، وطن، مادی ترقی اور سیاسی برتری کے جذبات نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ انسان کو اب بھی ایک مرکز محبت کی ضرورت ہے۔ وہ اب بھی اپنی دوڑ دھوپ کے لیے کوئی منتہا چاہتا ہے۔ اس کو اب بھی اس کی تڑپ ہے کہ کسی کی یاد سے دل کو گرمائے اور زندگی کی توانائی حاصل کرے۔ یہ نئے نئے بت دراصل اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں، مگر جس طرح پتھر کا بُت کوئی واقعی سہارا نہ تھا جو انسان کے کسی کام آسکتا، اسی طرح موجودہ زمانے کے یہ چمکدار بُت بھی نہایت کمزور رہیں جو کسی قوم کو حقیقی طاقت نہیں دے سکتے۔ جرمنی نے قوم کو اپنا بُت بنایا مگر یہ بُت اس کے کام نہ آسکا اور دوسری جنگ عظیم نے اس کو فنا کر دیا، اٹلی اور جاپان وطن کے بُت کو لے کر اٹھے مگر یہ بُت خود ان کے وطن کو ان کے لیے قبرستان بننے سے نہ روک سکا۔ برطانیہ اور فرانس نے مادّی اسباب کو بُت بنایا مگر وہ ان کے کام نہ آیا اور جس سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اس کا آفتاب غروب ہو کر رہا۔

قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات میں طاقت کا اصل خزانہ کہاں ہے وہ ہمارے ہاتھ میں اس مضبوط رسّی کا سرا دیتا ہے جس کو ٹوٹنا نہیں ہے اور جس کے سوا درحقیقت اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات میں حقیقی سہارا صرف ایک خدا کا ہے، اسی کے ذریعہ دلوں کو سکون ملتا ہے اسی کے ذریعہ زندگی کی حرارت حاصل ہوتی ہے، اس کا تعلق ہی وہ سب سے مضبوط رسی ہے جو مختلف انسانوں کو باہم جوڑتی ہے، وہی نازک مواقع پر ہمارا دستگیر اور مشکل حالات میں ہمارا مددگار ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ساری طاقت ہے، عزت اس قوم کے لیے ہے جو اس کا سہارا پکڑے اور جو اس کو چھوڑ دے اس کے لیے ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ علم دراصل تمام خزانوں کی کنجی ہے جس کو یہ ملا اسے سب کچھ مل گیا اور جو اس سے محروم رہا وہ ہر چیز سے محروم رہا۔

ہم ان سائنس دانوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں جنہوں نے بجلی اور بھاپ کی قوتوں کا انکشاف کیا جس سے انسانی تمدن کو ترقی کے مواقع ملے۔ مگر یہ کتاب جس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ صرف مشینوں کا علم نہیں بلکہ اس انسان کا علم ہے جس کے لیے ساری مشینیں بنی ہیں۔ اس کے ذریعہ ہم انسان کو سمجھتے ہیں، اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا راز معلوم کرتا ہے، اور یہی تاریخ کا وہ اٹل فیصلہ ہے جس سے قوموں کے بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن خدا کی آواز ہے، ہر بادشاہ کا ایک دستور ہوتا ہے۔ قرآن خدا کا دستور ہے جو تمام انسانوں کا آقا اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، وہ ہدایت ہے جو انسان کو صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے، وہ قانون ہے جس میں انسانیت کی تعمیر اور سوسائٹی کی تنظیم کے لیے صحیح ترین بنیادیں ہیں، وہ حکمت ہے جس میں دانائی کی تمام باتیں بھری ہوئی ہیں، وہ شفاء ہے جس میں انسانیت کی بیماریوں کا علاج ہے وہ فرقان ہے جو حق و باطل کی صحیح صحیح نشاندہی کرتا ہے، وہ روشنی ہے جس سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے راستے پاتے ہیں، وہ یاد دہانی ہے جو انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتی ہے، وہ نصیحت ہے جو مالک کائنات کی طرف سے اپنے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے، غرض اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اس کے سوا کہیں اور سے آدمی کو کچھ نہیں مل سکتا۔

قرآن خدا کی کتاب ہے، وہ ایک واسطہ ہے جس کے ذریعے خدا اپنے بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے وہ دنیا میں خدا کا محسوس نمائندہ ہے۔ وہ ان لوگوں کا سہارا ہے جو خدا کی رسّی کو مضبوط پکڑنا چاہتے ہوں وہ ایک پیمانہ ہے جس سے انسانوں کی خدا پرستی کو ناپا جاسکتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ کوئی شخص اپنے متعلق کس طرح یہ معلوم کرے کہ اس کو خدا سے تعلق پیدا ہوا یا نہیں تو اس کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے اندر ٹٹول کر دیکھے کہ اس کو قرآن سے کتنا تعلق ہے۔ قرآن سے تعلق ہی خدا سے تعلق کا مظہر ہے۔ آدمی کو قرآن سے جتنا لگاؤ ہوگا خدا سے بھی لگاؤ اسی قدر ہوگا۔ اگر قرآن اس کی محبوب ترین کتاب ہو تو سمجھنا چاہیے کہ خدا اس کے نزدیک محبوب ترین ہستی ہے اور اگر اس کی محبوب ترین کتاب کوئی اور ہو تو اس کا محبوب بھی وہی شخص ہوگا جس کی کتاب اس نے پسند کی ہے۔ خدا اس کا محبوب نہیں ہوسکتا۔ جس طرح خدا کو ہم قرآن کے سوا کہیں اور نہیں پاسکتے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کو پانے کے بعد قرآن کے سوا کوئی اور چیز ہماری محبوب ترین بن سکے۔

قرآن کا مطالعہ کرنے کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے آدمی اپنے رب کے احکام معلوم کرتا ہے بلکہ دنیا کی زندگی میں خدا سے قریب ہونے اور بندگی کی راہ پر انسان کو استوار رکھنے کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ قرآن میں آدمی اپنے رب سے ملاقات کرتا ہے۔ قرآن میں اس کے وعدوں اور بشارتوں کو دیکھتا ہے۔ اپنے آقا اور مالک کے بارے میں انسان کے فطری احساسات، جو اس کے اندر غیر شعوری طور پر امنڈتے ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ قرآن میں ان کو مصور کردیا گیا ہے۔ جب انسان کو یہ

احساس ہوتا ہے کہ اتھاہ کائنات کے اندر وہ ایک بے سہارا وجود ہے تو قرآن اس کے لیے منزل کا نشان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن آدمی کے لیے وہ یقین مہیا کرتا ہے جس کے مطابق آدمی دنیا میں اپنا مقام متعین کرسکے۔ قرآن کو محض پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عشق کی ضرورت ہے۔ قرآن سے جب تک غیر معمولی شغف نہ ہو یہ سارے فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں "تعاہد" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

قرآن سے یہ دل چسپی اور اس کی عظمت کا احساس بالواسطہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی مفسر یا ادیب کی زبان سے قرآن کے مضامین سن کر آدمی اس مفسر یا ادیب کا معتقد تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح قرآن سے حقیقی لگاؤ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ قرآن سے تعلق صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ خود قرآن کو پڑھا جائے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو براہ راست اس کے اپنے الفاظ کے ذریعہ سے ذہن میں اتارا جائے یہ محض خیالی بات نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک اہم نفسیاتی حقیقت ہے۔ کسی چیز سے آدمی اسی حیثیت سے متاثر ہوتا ہے جس حیثیت سے وہ اس سے ذاتی طور پر متعارف ہوا ہو۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ روئی اور پتھر کا نرم اور سخت ہونا محض اضافی ہے۔ حقیقۃً دونوں بالکل ایک ہیں کیونکہ اپنے آخری تجزیے میں دونوں ایک ہی طرح کے برقی ذرات کا مجموعہ ہیں۔ مگر یہ ایک خالص علمی بات ہے، حقیقی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص روئی کو نرم اور پتھر کو سخت نہ سمجھے۔ تاثر کبھی خارجی علم کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اس علم کا پابند ہوتا ہے جو اسے ذاتی طور پر حاصل ہوا ہے۔

اس مثال کی روشنی میں مسئلے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب ہم قرآن کو خود اس کے لفظوں میں سمجھے بغیر کسی دوسرے شخص کے مضامین اور اس کی تشریحات کے ذریعہ اس کا علم حاصل کرتے ہیں تو قدرتی طور پر جو صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک طرف قرآن کی عبارت ہوتی ہے جس کا کوئی مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آتا یا اگر سمجھ میں آتا ہے تو بہت معمولی سا۔ اور دوسری طرف ایک مصنف کی تحریر ہوتی ہے جو ہمارے لیے ایک قابلِ فہم زبان میں ہونے کی وجہ سے خود اپنے کو واضح کرتی ہے۔ خدا کا کلام سمجھ میں نہیں آتا، مگر مصنّف کا کلام خوب سمجھ میں آتا ہے۔ خدا کی بات میں کوئی خاص معنویت دکھائی نہیں دیتی اور مصنف کا کلام نہایت بامعنیٰ نظر آتا ہے۔ خدا کا کلام پڑھیے تو وہ دل کے اوپر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالتا مگر مصنّف کی عبارت دیکھیے تو رگ رگ میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ دو مختلف

عبارتوں کا دو بالکل مختلف حیثیتوں سے تعارف ہے جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ آدمی کا خارجی علم کہتا ہے کہ کلام برتر وہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا یا اگر سمجھ میں آتا ہے تو اس کے اندر کوئی بڑی بات نہیں ہے اور حقیقی تعارف یہ محسوس کراتا ہے کہ کلام برتر وہ ہے جو اپنی حیثیت کو خود تمہارے اوپر واضح کر رہا ہے۔ اس صورت حال کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کے بجائے کسی مصنف کی عظمت اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ روایتی ایمان کی بنا پر وہ اپنی زبان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ مصنف کی تحریروں کو قرآن پر ترجیح دیتا ہے مگر اس کا اندرونی احساس اس قسم کا ہو جاتا ہے گویا اصل واقعہ یہی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر خدا کے سوا کسی اور شخصیت کی پرستش میں مبتلا ہو جاتا ہے

یہ ایک عظیم فتنہ ہے جس کا خطرہ ہر اس شخص کو لاحق ہے جو خدا کے پیغام کو اس کی اپنی زبان کے بجائے کسی دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہو، جو قرآن کا براہ راست مطالعہ کرنے کے بجائے اس کے متعلق دوسرے لوگوں کی تحریروں کو پڑھ لینا کافی سمجھتا ہو، جو قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کے بجائے قرآن کو مفسروں اور ادیبوں کی تحریروں سے سمجھنا چاہتا ہو، جس طرح ہم اپنے پیٹ کی بھوک اسی وقت بجھا سکتے ہیں جب کہ خود کھائیں اور اپنے اندر ہضم کریں ٹھیک اسی طرح ہمارا ایمان بھی اسی وقت صحیح اور مکمل ہو سکتا ہے جب کہ ہم نے اس کو اس کے اصل ماخذ سے خود حاصل کیا ہو۔ کسی دوسرے کے واسطے سے ہم اس تک ٹھیک نہیں پہونچ سکتے۔

قرآن کے سلسلے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ قرآن کا مطالعہ کس طرح کیا جائے کہ وہ اپنی صحیح شکل میں ہمارے ذہنوں میں اتر جائے اور ہماری زندگی میں حقیقی طور پر شامل ہو سکے۔ اس کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے نہ کہ کسی اور چیز کی روشنی میں یہ مطالعہ لازمی طور پر قرآن کو سمجھنے کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ اپنی پہلے سے کسی طے کی ہوئی بات کو اس سے نکالنے کے لیے۔ جب بھی کوئی شخص متاثر ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ قرآن کو صحیح طور پر اخذ نہیں کر سکتا، ایسا آدمی قرآن کے آئینے میں اپنی بات دیکھے گا۔ نہ کہ قرآن کی بات کو۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کے ذہن میں کسی مطالعہ کے نتائج ہمیشہ اس تصور کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود ہو۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ چیزوں کو صرف اس حیثیت سے دیکھے جیسے کہ وہ فی الواقع ہوں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو

اسس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو عملاً یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی بعض باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسس نے قرآن کو پالیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اسس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید میں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آگئیں۔ ایسے آدمی کی مثال بالکل اس تعلیم یافتہ نوجوان کی سی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورتِ ملازمت" کے اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اسس مطالعہ کے ذریعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ پتے حاصل کرلے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بالکل بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کرسکے گا۔

متاثر ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہے جب کہ آدمی سمجھ رہا ہو کہ وہ اسلام ہی کے لیے قرآن کا مطالعہ کرنے جارہا ہے حالانکہ واقعتاً ایسا نہ ہو۔ فرض کیجیے آپ ایک ایسی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے اٹھی ہے مگر وہ صحیح اسلامی تحریک نہیں ہے (مثال کے طور پر خاکسار تحریک) اس کا انداز اور اس کی روح اسلام کے انداز اور اس کی روح سے مختلف ہے۔ وہ لوگوں کو اسلام کے نام پر بُلاتی ہے اور اپنی دعوت کی تشریح کے لیے اسلامی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتی ہے مگر اس کی حرکت ٹھیک اس سمت میں نہیں ہے جو کہ دراصل اسلام کی ہے۔

اس مثال میں حقیقی صورت حال یہ ہے کہ جس تحریک نے آپ کو متاثر کیا ہے وہ صحیح اسلامی تحریک نہیں ہے مگر آپ کے ذہن میں جو تصور قائم ہوا ہے وہ یہ کہ یہی صحیح ترین اسلامی تحریک ہے اور اسس کی خدمت کرنا اسلام کی خدمت کرنا ہے۔ اس تحریک نے آپ کی فکری قوتوں کو اپنے انداز کے مطابق موڑ دیا ہے۔ اب ایک ایسا ذہن لے کر جب آپ قرآن کا مطالعہ شروع کریں گے تو بہ ظاہر آپ یہ سمجھیں گے کہ آپ قرآن کو حاصل کرنے جارہے ہیں مگر جو واقعہ ہے وہ یہ کہ آپ قرآن کے لفظوں میں اپنی باتت کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح مطالعہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن کی بہت سی چیزیں آپ کو

بے کار معلوم ہوں گی کیونکہ وہ آپ کے ذہنی سانچے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں اور کچھ چیزیں ایسی ہوں گی جو آپ کو پسند آجائیں گی کیونکہ وہ آپ کے ذہنی سانچے میں بیٹھ رہی ہیں۔ اس طرح آپ قرآن کی کچھ باتوں کو لے لیں گے اور اس کی بہت سی باتوں کو چھوڑ دیں گے۔ آپ اپنے طور پر یہ سمجھتے رہیں گے کہ آپ نے قرآن کو پالیا ہے مگر جو حقیقت ہوگی وہ یہ کہ آپ قرآن سے محروم ہوں گے۔ آپ اسلام کے نام پر خود اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ آپ قرآن کے حوالے سے گفتگو کریں گے مگر حقیقۃً آپ کی گفتگو کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس طرح مطالعہ کے وقت انسان کا ذہنی تصور جس درجے میں اسلام سے ہٹا ہوا ہو اسی کے بقدر اس کے مطالعۂ قرآن میں نقص ہو جاتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ جب صورت حال یہ ہے تو کسی کے بارے میں بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مطالعہ اس کو صحیح نتائج تک پہونچا سکے گا۔ کیونکہ قرآن کے مطالعہ کے بعد ہی تو قرآن کے مطابق کسی کا ذہن بن سکتا ہے۔ پھر ایک شخص جو ابھی قرآن کا مطالعہ کرنے جا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی بار ہر شخص کی یہی حیثیت ہوتی ہے تو وہ کس طرح قرآن کے مطابق اپنے ذہن کو بنا سکتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مطالعہ کرنے سے پہلے آدمی کا ذہن قرآن کے مطابق بن چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کے اندر اس بات کی صلاحیت ہونی چاہیے کہ قرآن سے جو کچھ اسے ملے وہ اس کو بے چون وچرا قبول کرلے۔ علماء نے یہ کہا ہے کہ قرآن سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس کے لیے خدا سے دعا کرے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی کے اندر ہدایت کو قبول کرنے کی آمادگی ہونی چاہیے۔ دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ مخصوص الفاظ اپنی زبان سے ادا کر کے تلاوت کا آغاز کیا جائے۔ بلکہ یہ دعا دراصل دل کی اس تڑپ کا اظہار ہے کہ بندہ ہدایت قبول کرنے کے لیے بے تاب ہے، وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے، اس کی طلب پوری طرح اُبھری ہوئی ہے، وہ ہمہ تن طالبِ حق بن کر خدا سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اسے روشنی دے، وہ اس کے اندر صحیح خیالات کا فیضان کرے، وہ قرآن کے مطالب کو اس کے لیے کھول دے تاکہ وہ اسے جذب کر سکے۔ یہی جذبۂ طلب دراصل وہ چیز ہے جو آدمی کو قبول حق تک لے جاتی ہے اور جس نے اپنی فطری طلب پر خواہشات کے پردے ڈال لیے ہوں اسے کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں مل سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے ہم کو اور کون سے علوم جاننے کی ضرورت ہے۔ اس گفتگو کو میں دو حصوں میں تقسیم کردوں گا۔ قرآن کے طالب علم دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو زیادہ مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں اور دوسرے وہ جو اپنے حالات کے تحت اس کو صرف سادہ طریقے پر پڑھنا چاہتے ہوں۔ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے صرف ایک چیز سیکھ لینا کافی ہے۔ یعنی قرآن کی زبان۔ اور پہلی قسم کے لوگوں کو اس کے علاوہ مزید چار علوم میں واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح دونوں گروہ کے لحاظ سے یہ کل پانچ متعلق علوم ہوئے جو کہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ عربی زبان۔
۲۔ حدیث اور تفسیر۔
۳۔ سائنس یعنی علوم فطرت۔
۴۔ ان قوموں کی تاریخ جن میں خدا کے رسول آئے۔
۵۔ قدیم آسمانی صحیفے۔

(۱) قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے عربی زبان کا جاننا بالکل لازمی ہے۔ اس کی اہمیت کسی ذاتی شرف کی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ اس کے بغیر مطالعۂ قرآن کی ابتدا ہی نہیں کی جاسکتی یہ اس سفر کا پہلا زینہ ہے جس کو طے کیے بغیر اوپر چڑھا نہیں جاسکتا۔ عربی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے بغیر ہم آیاتِ الٰہی کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کتاب جس زبان میں ہو اس زبان کو جانے بغیر کتاب کو سمجھنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، مگر عربی جاننے کی ضرورت ہم کو صرف اسی لیے نہیں ہے۔ اگر اس کی ضرورت صرف اسی قدر ہوتی تو یہ کام ترجموں کے ذریعہ بھی لیا جاسکتا تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر عربی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ قرآن کے لفظوں میں جو زور اور اثر انگیزی بھری ہوئی ہے اس کو اپنے ذہن میں منتقل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی اس کی ادبی نزاکتوں سے آشنا نہ ہو۔

ہر عبارت کا ایک مطلب ہوتا ہے جس کے لیے وہ ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ مطلب اس طرح بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان لفظوں کا ترجمہ کر دیا جائے جن میں وہ عبارت مرتب کی گئی ہے یا ڈکشنری میں دیکھ کر اس کو حل کر لیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ہر کامیاب عبارت میں ایک تاثیر بھی ہوتی ہے

جو پڑھنے والے کو اپنی معانی کی طرف کھینچتی ہے ۔ یہ تاثیر معانی سے زیادہ اس کے الفاظ اور اندازِ بیان میں ہوتی ہے ۔ عبارت جن لفظوں میں مرتب کی گئی ہے اگر آدمی ان الفاظ کی حکمت اور بلاغت کو نہ جانتا ہو تو وہ اس کے ترجمے سے اس کا مطلب تو شاید سمجھ جائے مگر اس سے کوئی اثر قبول نہیں کر سکتا۔

قرآن کی عبارتوں میں بے پناہ روانی ہے، اس کے اندر حیرت انگیز طور پر معانی کو لفظوں کی صورت میں مجسم کر دیا گیا ہے ۔ قرآن میں کہیں یقین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ، کہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے ، کہیں اعمالِ خیر پر ابھارا گیا ہے ۔ کہیں اپنے دعوے کے حق میں انسان کی فطرت اور کائنات کی شہادتوں سے استدلال کیا گیا ہے ، کہیں انسان کی کامیابی و ناکامی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے ، مگر یہ سب کچھ صرف بیانِ واقعہ کے طور پر نہیں ہے بلکہ ایسے بلیغ اور موثر انداز میں ہے کہ ہر جگہ آدمی پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کہ دراصل وہاں مقصود ہے ۔ قرآن کا اندازِ بیان ایسا مسحور کن ہے کہ آدمی اس کو صرف پڑھتا نہیں بلکہ اس میں غرق ہو جاتا ہے وہ اس کو صرف پڑھ کر نہیں چھوڑ دیتا بلکہ وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس پر ایمان لائے ۔ قرآن کا یہ اسلوب نصف قرآن ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے عربی زبان کا سیکھنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کا حقیقی معنوں میں کوئی بدل نہیں ۔ آخرت میں خدا کے نیک بندوں کو اپنے رب سے جو قربت نصیب ہوگی وہ دراصل اس کوشش کا نتیجہ ہوگی جو دنیا میں آدمی اپنے رب سے قریب ہونے کے لیے کرتا ہے اور یہ قربت کلامِ الٰہی سے گہرا تعلق قائم کیے بغیر نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے جو شخص بھی خدا کا بندہ بننا چاہتا ہو اور آخرت میں خدا کی رحمت حاصل کرنے کا امیدوار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کتاب کی زبان سیکھے جس میں اللہ تعالٰے نے اس سے کلام کیا ہے ۔ آخرت کے مسافر کے لیے عربی زبان کا سیکھنا بالکل اسی قسم کی ایک ضرورت ہے جیسے کسی غیر ملک کی سفارت حاصل کرنے کے لیے اس ملک کے حالات جاننا اور وہاں کی زبان سیکھنا ۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ضرورت مسلّم مگر موجودہ مصروف زمانے میں ہر شخص کو اتنا موقع کہاں ہے کہ وہ ایک غیر ملک کی زبان میں واقفیت اور مہارت حاصل کرے ۔ مگر کیا فی الواقع صورتِ حال یہی ہے کہ موجودہ زمانے کے انسان کے لیے کوئی نئی زبان سیکھنا یا کسی زبان میں اپنی واقفیت کو بڑھانا ممکن نہیں رہا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے ، یہ کام آج جتنا کیا جا رہا ہے ۔ پہلے شاید کبھی نہیں کیا

گیا تھا۔ ہماری آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ آزادی کے بعد ملک کے جن مقامات پر ہندی کو سرکاری کام کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا وہاں کے وہ ملازمین جو اب تک ہندی زبان سے ناواقف تھے، انہوں نے رات دن ایک کر کے ہندی زبان سیکھی اور اب اس قدر بے تکلفی کے ساتھ ہندی میں کام کرتے ہیں گویا وہ ہمیشہ سے اس کو جانتے تھے۔ اسی طرح جو لوگ دنیوی ترقی چاہتے ہیں ان کو ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ پرائیویٹ طور پر تیاری کر کے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات دیتے رہتے ہیں اور یہ سب کچھ دوسرا کام کرتے ہوئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمی اگر ہے تو فرصت کی نہیں بلکہ ارادہ کی ہے، اگر یہ چیز موجود ہو تو نئی زبان بھی سیکھی جا سکتی ہے اور دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ایک غیر زبان میں اپنی واقفیت بڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔

سادہ انداز میں قرآن سے استفادہ کرنے کے لیے صرف عربی زبان کا جاننا کافی ہے۔ مگر جو لوگ زیادہ گہرائی کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے مزید چند چیزوں میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۲) قرآن کا گہرا مطالعہ کرنے کے لیے پہلی مددگار چیز سنت اور تفسیر کا علم ہے۔ ان دونوں کو ہم نے ایک خانے میں اس لیے نہیں رکھا ہے کہ دونوں کا مقام ایک ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنتِ صحیحہ اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے ایک کا مطالعہ کرنا گویا دوسرے کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس کے برعکس تفسیر کسی انسان کے مطالعۂ قرآن کے نتائج کا نام ہے اور انسان کا مطالعہ خواہ وہ کسی بھی شخص کا ہو اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ اس لیے تفسیر کبھی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ اس کو کسی حال میں سنت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس فرق کے باوجود ان دونوں کو ایک سلسلے میں رکھنے کی وجہ دراصل وہ تاریخی نوعیت ہے جو قرآن کے مقابلے میں اسے حاصل ہے۔ قرآن جس طرح مکمل اور محفوظ شکل میں ہم تک پہونچا ہے روایات اسی طرح ہم تک نہیں پہونچی ہیں۔ صحیح روایات کے ساتھ بہت سی غلط روایات بھی شامل ہو گئیں ہیں۔ اسی لیے علماء نے قرآن کے مقابلے میں اس کو قطعی علم کے بجائے ظنی علم کی حیثیت دی ہے۔ اگر احادیث میں ظن اور شبہ کا دخل نہ ہوتا اور ان کا ایسا کوئی ذخیرہ موجود ہوتا جس کو قطعی طور پر محفوظ قرار دیا جا سکے تو احادیث کو بھی اسی طرح اصل کا درجہ دیا جاتا جیسا کہ خود قرآن کا ہے۔ صرف حدیث ہی نہیں بلکہ وہ تمام مآخذ جو قرآن سے متعلق ہیں ان سب کا یہی معاملہ ہے۔ مثلاً تاریخ اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے صحیفے اگر اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہوتے تو

یہ سب بھی قرآن ہی کی طرح اصل قرار پاتے اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے ۔

تفسیر اور روایات کا ذخیرہ قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک اہم مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحیح روایات کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خود قرآن لانے والے کی زبان سے قرآن کی تشریح ہے، وہ ان امور کی تفصیل ہے جن کو کتابِ الٰہی نے مجمل چھوڑ دیا ہے، وہ ان اشارات کی تعیین ہے جن کو قرآن نے واضح نہیں کیا ہے۔ وہ ان مقاصد کی مزید وضاحت ہے جن کے لیے قرآن نازل کیا گیا تھا، اس لیے جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ مہبط قرآن کے ارشادات سے استفادہ کرے، اس کے بغیر وہ قرآن کے مطالب تک نہیں پہونچ سکتا۔ اسی طرح تفاسیر کا ذخیرہ امت کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے جو صدیوں سے قرآن کو سمجھنے کے سلسلے میں وہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ تاریخ کے لمبے ادوار میں قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کے نتائج فکر ہیں جن کو چھوڑ کر قرآن کا مطالعہ کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ پچھلی صدیوں میں سائنس نے جو کچھ دریافتیں کی ہیں ان سب کو چھوڑ کر میں از سر نو کائنات پر غور کروں گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن کے مطالعہ کے لیے تفسیر اور روایات کے ذخیرے سے مدد لیں۔ ان کو چھوڑ کر قرآن کا مطالعہ کرنا ایک سر پھرے آدمی کا کام تو ہو سکتا ہے مگر کوئی سنجیدہ آدمی ہرگز اس قسم کی حماقت نہیں کر سکتا۔

(۳) قرآن نے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے دو چیزوں سے خاص طور پر استدلال کیا ہے۔ ایک زمین و آسمان کی تخلیق اور دوسرے پچھلی قوموں کے حالات، قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ اپنے دعوے کے حق میں فطرت کے دلائل دے کر تاریخی واقعات سے اس کا مزید استحکام کرے۔ پہلی چیز اس واقعہ کی محسوس شہادت ہے کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جس کی مرضی معلوم کرنا ہمارے لیے ضروری ہے، اس کو چھوڑ کر انسان کامیابی تک نہیں پہونچ سکتا۔ اور دوسری چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ہر زمانے میں کچھ انسانوں کے ذریعہ اپنی مرضی بھیجتا رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو قبول کیا وہ کامیاب ہوئے اور جنہوں نے اس کو نہیں مانا وہ تباہ کر دیئے گئے۔ کائنات زبان حال سے جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اقوام سابقہ کی تاریخ زبانِ قال سے اسی حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔

یہ دونوں دلیلیں آج بھی قرآن کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآن اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ وہ عام معنوں میں کوئی تاریخ ہے، مگر سائنس

اور تاریخ یہی وہ خاص علوم ہیں جن پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے۔ اس لیے قرآن کا کوئی طالب علم ان علوم سے بے نیاز رہ کر قرآن سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

پہلے قسم کے استدلال کے سلسلے میں قرآن نے آفاق و انفس کی بہت سی نشانیوں کا ذکر کیا ہے اور ان پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ دلائل قرآن میں اس طرح نہیں آئے ہیں کہ ان کا تفصیلی تجزیہ کر کے سائنٹفک انداز میں ان کے نتائج مرتب کیے گئے ہوں بلکہ کائنات کی نشانیوں کا ذکر کر کے ان کی مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جو غور کرنے والے کے لیے رہ نمائی کا کام دیتی ہیں۔ گویا دلائل کی تفصیل نہیں ہے بلکہ دلائل کے عنوانات ہیں۔ اس لیے ان سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ کائنات کے متعلق مزید معلومات کو سامنے رکھ کر ان کا مطالعہ کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ معلومات اور نتائج آدمی کے ذہن میں ہونے چاہئیں جن سے ان دلائل کی وضاحت ہوتی ہے اور جو اس کے اشارات کو مفصل بنانے والے ہیں۔

مثلاً قرآن کہتا ہے هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبها
(وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے فرماں بردار بنایا تو چلو پھرو اس کے کندھوں پر)
ان الفاظ میں جس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہم کو قرآن میں نہیں ملے گی بلکہ خارجی لٹریچر میں اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔ خارجی مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ زمین کو کس طرح اتھاہ خلا کے اندر ٹھیرا کر ہمارے لیے قابل رہائش بنایا گیا ہے اور کس طرح مختلف قسم کے اہتمام کے ذریعہ اس کو زندگی کے بقا اور انسانی تمدن کے ارتقار کے لیے سازگار بنایا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور اس کا مدبر صرف ایک خدا ہے وحدہٗ لاشریک ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات ایک الل ٹپ کارخانہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم اسکیم کا آغاز ہے جس کا انجام آنا چاہیے۔ کائنات کی اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد وہ انسان کو اس کے ماننے کی دعوت دیتا ہے وہ اس سے کہتا ہے کہ اس تصور کائنات کے لازم معنی یہ ہیں کہ کائنات کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہو اور کائنات کی تمام چیزوں کے لیے کامیابی کا راستہ صرف یہ ہو کہ وہ خدا کی مرضی کو پالیں۔ اس طرح وہ رسالت اور وحی کی ضرورت ثابت کر کے اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر وہ انسان کو کائنات کے ان انتظامات کی یاد دلاتا ہے جو خدا نے انسان کے لیے کیے ہیں اور جن کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں

کیا جا سکتا۔ ان احسانات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے محسن کے آگے جھک جائے۔ پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ وہ کس قدر عاجز اور حقیر مخلوق ہے اور خود اس کے اپنے عجز ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ خدا کی رسی کو مضبوط تھام لے، جس کے سوا دراصل یہاں کوئی سہارا نہیں ہے۔

یہ تمام باتیں جو قرآن پیش کرتا ہے ان سب کے سلسلے میں اس کا اصل استدلال انسان کے اپنے وجود اور زمین و آسمان کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں سے پُر ہے وہ ہمارے مشاہدات اور تجربات ہی کی دلیل سے ہم کو اپنے نظریہ کا مومن بنانا چاہتا ہے اس لیے ان نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کو ان کے بارے میں ضروری علم حاصل ہو۔ جب قرآن کائنات کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرے تو ہم کو معلوم ہو کہ وہ کیا ہے، وہ جب کسی نشانی کا حوالہ دے تو ہم جانتے ہوں کہ ہماری زندگی کے لیے اس کی کیا اہمیت ہے، وہ جب کسی دلیل کا ذکر کرے تو ہم اس دلیل کے اطراف وجوانب سے اتنی واقفیت رکھتے ہیں کہ اس پر غور کر سکیں۔ غرض وہ جب بھی کائنات کے کسی رُخ کو ہمارے سامنے لائے تو ہماری آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے کھلی ہوئی ہوں اور ہمارا ذہن اس کو سمجھنے کے لیے ضروری واقفیت اپنے پاس رکھتا ہو۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں کائنات کی جو دلیلیں مذکور ہوئی ہیں، وہ آخر مجمل انداز ہی میں کیوں ہیں ان کو اتنا مفصل ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں ان کو پڑھ لینا کافی ہوتا، خارجی معلومات لے کر اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جواب یہ ہے کہ انسانی زبان میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں لکھی جا سکتی جس میں وہ تمام باتیں اپنی ساری تفصیل کے ساتھ درج ہوں جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے ہر مصنف کو لازمی طور پر یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ اس کا پڑھنے والا فلاں فلاں قسم کی معلومات پہلے سے رکھتا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں شاید صرف انسائیکلوپیڈیا کا وجود ہو، کوئی مختصر کتاب لکھی ہی نہ جا سکے۔ یہی وجہ ہے قرآن نے بہت سے امور میں صرف اشارات سے کام لیا ہے۔ جو باتیں وحی کے بغیر معلوم نہیں کی جا سکتیں ان کی تو قرآن میں پوری تفصیل کی گئی ہے مگر وہ باتیں جن کے جاننے کے لیے لازمی طور پر وحی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر بھی انہیں معلوم کر سکتا ہے ایسی باتوں کی طرف صرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور انسان سے کہا گیا ہے کہ ان پر غور کرو۔

اس کے علاوہ قرآن کے اس طرزِ بیان کے پیچھے ایک اور عظیم مصلحت ہے۔ قرآن ایک عام آدمی

کے لیے بھی ہے اور ایک فلسفی کے لیے بھی ۔ وہ ماضی کے لیے بھی تھا اور مستقبل کے لیے بھی ہے ۔ اس لیے اس نے اپنی گفتگو کا ایسا انداز اختیار کیا جو ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے انسان کے لیے قابل فہم ہو سکتا تھا اور پھر ان تمام لوگوں کے لیے بھی اس کے اندر نصیحت ہے جو آئندہ حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں رکھ کر قرآن کا مطالعہ کریں ۔ قرآن نے ان دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو بعد کے زمانوں میں حاصل شدہ معلومات کو بھی سمیٹ لیتے ہیں ۔ یہ قرآنی اندازِ کلام کا اعجاز ہے کہ کائنات کی نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس کے اندر ایک ایسا آدمی بھی اپنی تسکین پا لیتا ہے جو کائنات کے بارے میں بہت تھوڑی معلومات رکھتا ہو اور انہیں الفاظ میں ایک سائنس داں اور فلسفی کے لیے بھی تسکین وتشفی کا سامان موجود ہے ۔

۴ ۔ دوسری چیز جس پر قرآن کے استدلال کی بنیاد ہے وہ تاریخ ہے ۔ قرآن انسانی تاریخ کو دو دوروں میں تقسیم کرتا ہے ۔ ایک چھٹی صدی عیسوی سے قبل کی تاریخ جس کو وہ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ حق و باطل کی آویزش کی تاریخ ہے جس میں لازمی طور پر ہمیشہ حق کو غلبہ ہوا ہے اور باطل کو شکست ہوئی ہے ۔ قرآن کے مطابق چھٹی صدی عیسوی تک انسانی تاریخ جس انداز میں سفر کرتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر انسان نے جتنی بھی آبادیاں قائم کیں ان میں خدا کی طرف سے ایک نمائندہ (رسول) آیا ، اس نے انسانوں کو ان کی زندگی کا مقصد بتایا ، اس نے کہا کہ خدا نے مجھ کو یہ پیغام دے کر تمہارے پاس بھیجا ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اور میں جو کچھ کہوں اس کو مانو ، اس نے کہا کہ اگر تم میری بات نہ مانوگے تو تباہ کر دیئے جاؤگے ۔ اس طرح نبی کا یہ چیلنج کہ زندگی و موت کا انحصار اس کی دعوت کو ماننے یا نہ ماننے پر ہے ، یہ خود نبی کے دعوے کی صحت کو جانچنے کا ایک معیار بن گیا ۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ کسی استثناء کے بغیر مسلسل اس دعوے کے حق میں فیصلہ کرتی آئی ہے ۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول اٹھا تو کچھ لوگوں نے اس کی دعوت کو مانا اور کچھ لوگوں نے اس کا انکار کیا ۔ اگر رسول کے پیرؤوں کی تعداد اتنی ہوئی کہ وہ ایک منظم گروہ کی شکل اختیار کر سکے تو اس کو منکرین کے گروہ سے ٹکرایا گیا اور انہیں شکست دے کر ختم کر دیا گیا اور اگر رسول کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوئے تو خدا نے اپنی غیر معمولی مدد بھیج کر اس کو غالب کیا ۔ حجت تمام کرنے کے بعد بالآخر رسول کی زبان سے یہ چیلنج دے دیا گیا کہ :

تمتعوا في داركم ثلثة ايام — اپنی بستیوں میں تین دن اور چل پھر لو ۔ (اس کے

ذالك وعد غیر مکذوب — بعد تمہارے لیے زندگی کا کوئی موقع نہیں) یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے ۔ (ہود)

چنانچہ خدا کا عذاب اپنے ٹھیک وقت پر آیا اور نبی اور اس کے پیرؤوں کے سوا سب لوگ ہلاک کر دیئے گئے ۔ اس طرح ہر زمانے میں خدا اپنے رسولوں کو غالب کرکے اس کے دعوے کا صحیح ہونا ثابت کرتا رہا ہے ۔ یہ گویا تاریخ کی شہادت ہے کہ پچھلی تاریخ میں جن لوگوں نے اپنے آپ کو نمائندہ الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا وہ واقعی طور پر خدا کے نمائندے تھے اور انسان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیمات کو اختیار کرے ، جو ایسا نہ کرے گا تباہ و برباد ہو جائے گا ٹھیک یہی صورت حال خود آخری رسول کے سلسلے میں پیش آئی جن کے متعلق حضرت مسیح کا یہ قول پورا ہوا کہ " جو اس سے ٹکرائے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا "

تاریخ کی یہ نوعیت ہم کو تاریخ کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ ہم قرآن کے ان وعدوں کو سمجھ سکیں جو اس نے پچھلی قوموں کے بارے میں کیے ہیں ۔ مگر اس سلسلے میں ایک بڑی زحمت یہ ہے کہ پچھلی تاریخ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں ہے پچھلی صدیوں میں جن لوگوں کے ہاتھوں علوم کا نشو ونما ہوا ہے انہوں نے سائنس اور تاریخ دونوں کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی ہے ۔ کائنات کا مطالعہ انہوں نے اس ڈھنگ سے کیا گویا وہ بذاتِ خود کوئی مستقل چیز ہے اور اپنے آپ حرکت کرتی ہے یہ مطالعہ ان کو صرف اس حد تک پہونچاتا ہے کہ " جو ہے وہ کیا ہے " وہ اس کی طرف نشاندہی نہیں کرتا کہ " جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے "، اس کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ علماء سائنس خاموشی اختیار کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی کہ جو کچھ ہم کو محسوس ہوتا ہے وہی اصل حقیقت ہے اس کے پیچھے کوئی اور حقیقت نہیں ۔ کائنات کا حیرت انگیز نظم اور اس کے مختلف اجزا کا باہمی توافق اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کے پیچھے کوئی بالاتر ذہن کام کر رہا ہے بلکہ یہ محض ایک حسن اتفاق ہے ۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ۔

اسی طرح تاریخ نگاری کا رُخ بھی بالکل دوسرا اختیار کیا گیا ہے ۔ قدیم تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال کے نہایت حیرت انگیز واقعات نظر آتے ہیں زمین کی تہوں سے ایسے نشانات برآمد ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتنی ترقی یافتہ اور مہذب قومیں تھیں جو زمین کے نیچے دبا دی گئیں ، مگر

ہمارے مورخین کے نزدیک ان واقعات کا حق و باطل کی جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً مصر کی تاریخ میں فرعون کی غرقابی کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ بادشاہ سلامت ایک روز دریا پر نہانے گئے تھے کہ اتفاق سے وہاں ڈوب گئے۔ اس طرح سابق مورخین کا نقطہ نظر اس فلسفۂ تاریخ سے بالکل مختلف ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

غرض سائنس اور تاریخ دونوں کا رُخ موجودہ زمانے میں غلط ہو گیا ہے۔ تاہم جہاں تک پہلی چیز یعنی علومِ فطرت کا تعلق ہے، اوّلاً تو تمام سائنسدانوں کا انداز یکساں نہیں ہے، دوسرے ان کے اخذ کردہ نتائج کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ صحیح رُخ کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ ان کے سلسلے میں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جن واقعات کو وہ اتفاق یا قانونِ علّت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان کو خدا کے تصرّف کا نتیجہ ثابت کریں۔ مگر تاریخ کے سلسلے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ کیا کیا جائے۔ قرآن کے سوا صرف بنی اسرائیل کا مذہبی لٹریچر ہے جو قرآن کے تاریخی نظریے کی تائید کرتا ہے اس کے علاوہ غالباً کہیں سے بھی اس کی تائید نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں قرآن کے طالب علم کو بہت سے کام کرنے ہیں۔ مثلاً دوسرے مذاہب کے لٹریچر کا اس حیثیت سے جائزہ لینا کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کا کیا فلسفہ پیش کرتا ہے، ان کے یہاں بہت سی غلط روایات شامل ہو گئی ہیں مگر یہ عین ممکن ہے کہ ایسے اشارات اور ایسی بنیادیں مل سکیں جن سے قرآن کے تصورِ تاریخ کے حق میں استدلالی قرینہ حاصل کیا جا سکے۔ اسی طرح قدیم ترین مورخوں کے یہاں چھان بین کرنی ہے کہ انہوں نے سابقہ اقوام کے حالات میں کیا کچھ بیان کیا ہے، آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو نشانات اور کتبات برآمد ہوئے ہیں ان کا جائزہ لے کر دیکھنا ہے کہ ان کے ذریعہ سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کی کس حد تک تائید ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت مشکل کام ہے مگر قرآنی استدلال کے ایک جز کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں بھی کچھ کام کیا جائے۔ یہ کام ہر طالب قرآن کا نہیں ہے، مگر کچھ لوگوں کو ضرور یہ کام کرنا چاہیے تاکہ دوسرے لوگ ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

علم الحیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ تقریباً تین لاکھ برس سے اس زمین پر آباد ہے۔ مگر ان کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ تمام ذہنی صلاحیتوں کے باوجود انسان کی ترقی کی عمر ابھی چند سو سال ہے۔ اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں برس وہ

خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا رہا اور پتھر کے چند بے ڈھنگے ہتھیار بنانے کے سوا اس نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ اس کو اپنے ہتھیاروں کو سیدھی دھار دینے اور آگ کے استعمال کو سیکھنے کے لیے ہزاروں برس درکار ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اب سے چھ ہزار برس قبل انسان کو وادیٔ نیل میں خودرو جو اگتے ہوئے دکھائی دیئے اور اس مشاہدے سے اس نے زراعت کا راز معلوم کیا۔ طریقۂ زراعت کے انکشاف اور اس کے اختیار کرنے سے انسان سکونتی زندگی پر مجبور ہوا اور اس کے بعد تمدن کی بنیاد پڑی۔ مگر یہ انسانی تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر بار بار نہایت شاندار تمدن پیدا ہوئے اور مٹا دیئے گئے، قومیں ابھریں اور فنا ہو گئیں، پچھلے زمانے میں جب نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی قوم میں نبی کا آنا دراصل اس کے لیے خدا کی عدالت کا قائم ہونا تھا۔ تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ قومیں ابھریں اور انہوں نے بڑے بڑے تمدن قائم کیے۔ مشہور مورخ سر فلنڈرس (Sir Flinders) نے اپنی کتاب انقلاباتِ تمدن میں لکھا ہے کہ تمدن ایک مظہر ہے جو متوالی ہے۔ یعنی بار بار آتا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ پچھلے دس ہزار برسوں میں تقریباً آٹھ "تمدنی دور" گزرے ہیں۔ ہر دور سے قبل ایک زمانہ بربریت کا گزرا ہے اور اس کے بعد عہدِ زوال آیا ہے۔ اس نظریۂ تاریخ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مگر جب نبی آیا اور انہوں نے اس کی اطاعت نہیں کی تو خدا کی عدالت سے ان کے لیے فنا کا فیصلہ ہوا اور وہ اپنے بڑے بڑے شہروں اور قلعوں کے ساتھ تباہ کر دی گئیں۔ دوسرے دور کے بعد اب یہ عمل قیامت کے دن ہوگا۔ اس وقت ساری دنیا بیک وقت فنا کر کے تمام انسان خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے، اس صورت حال نے قدیم دور میں تمدن کو ترقی اور بقا کے وہ مواقع نہیں دیئے جن کا موقع بعد کے دور میں حاصل ہوا ہے۔ قدیم تاریخ اور جدید تاریخ کے اس پہلو کا علم نہایت ایمان افروز بھی ہے اور قرآنی دلائل کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم بھی۔

۵۔ اس سلسلے میں آخری چیز جو قرآن کے مطالعہ کے لیے مددگار علم کی حیثیت رکھتی ہے وہ بنی اسرائیل کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ ہے جن کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ کے سلسلے میں صحفِ بنی اسرائیل کا مطالعہ کرنا، گویا ایک آسمانی کتاب کو سمجھنے کے لیے دوسری آسمانی کتاب سے مدد لینا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہم کتبِ سابقہ کو بطور معیار تسلیم کر رہے

ہیں۔ یہ کتابیں کبھی معیار نہیں بن سکتیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان میں تحریف ہوچکی ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی ہیں۔ یہ واقعہ کہ قرآن آسمان سے اترنے والی آخری کتاب ہے اور بقیہ تمام کتابیں اس سے پہلے کی ہیں، صرف یہ حقیقت اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ قرآن ہی کو معیار ہونا چاہیے۔ کسی بادشاہ کا آخری فرمان اس کے سابقہ فرامین کا ناسخ ہوتا ہے نہ کہ سابقہ فرامین اس کے آخری فرمان کی تنسیخ کرتے ہیں۔ جو شخص آخری فرمان کو چھوڑ کر سابقہ فرمان کی پیروی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی تو مالک ہی کی طرف سے آیا ہے وہ قطعی طور پر نفس پرستی میں مبتلا ہے، وہ اپنی رائے کی پرستش کر رہا ہے نہ کہ صاحب فرمان کے حکم کی۔ اس لیے قرآن خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقیہ کتابوں سے ہم قرآن کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں مدد لے سکتے ہیں مگر ان کو حجت نہیں بنا سکتے۔

مدد لینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے۔ دوسرے تعلیمات کے اعتبار سے۔ یہ معلوم ہے کہ انجیل اور تورات کی اصل زبان عبرانی ہے اور عربی اور عبرانی دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر دونوں زبانوں میں کافی مشابہت ہے اور ایک زبان دوسری زبان کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ پھر آسمانی کتابوں کا ایک خاص انداز بیان ہے۔ اس طرح کتب مقدسہ کا مطالعہ اس مخصوص طرز بیان سے ہم کو واقف کراتا ہے اور اس کی بلاغت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو آسمانی کتابوں کا ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے قرآن کے بہت سے الفاظ اور بیانات کا مطلب سمجھنے میں کتب سابقہ سے مدد لی ہے اور نہایت مفید معانی تک رسائی حاصل کی ہے۔

دوسری چیز تعلیمات ہیں۔ اگر تفصیل اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے جزئی فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ایک واقعہ ہے کہ پچھلی کتابوں میں بھی وہی تمام باتیں خدا کی طرف سے نازل کی گئی تھیں جو قرآن کے ذریعے ہم تک بھیجی گئیں ہیں۔ اس لیے اپنی اصل حقیقت کے اعتبار دونوں ایک دوسرے کی تائید کرنے والے ہیں نہ کہ اختلاف کرنے والے۔ کتب سابقہ کی یہی وہ حیثیت ہے جس کی بنا پر وہ مطالعہ قرآن کے لیے ایک مفید ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں جس طرح قرآن میں ایک ہی مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس طرح کی کسی ایک آیت کو

سمجھنے کے لیے اسی قسم کی دوسری آیت سے مدد ملتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح خدا کا کلام جو بعد کے زمانے میں قرآن کی شکل میں آیا ہے، وہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء پر مختلف شکلوں میں نازل ہوتا رہا ہے۔ اس لیے سابقہ کتب میں خدا کا جو کلام ہے وہ اس کے بعد کے کلام کو سمجھنے میں ایک مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کے مطالعہ کے سلسلہ میں مددگار علوم کا ایک مختصر ذکر ہے۔ آخر میں اسی بات کو میں پھر دہراؤں گا جس کو میں شروع کہہ چکا ہوں۔ یعنی یہ کہ ان سب سے بڑھ کر جو چیز قرآن سے استفادہ یا فہم قرآن کے لیے ضروری ہے وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔ بقیہ علوم قرآن کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں مگر قرآن کو جذب کرنے کے لیے کسی خارجی علم کی ضرورت نہیں۔ انسان کا اپنا جذبہ طلب ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے وہ قرآن کو جذب کرتا ہے۔ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ کسی کے ذہن میں قرآن کا اتر جانا دوسرے لفظوں میں یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس شخص کو ہدایت حاصل ہو گئی۔ اس کو خیر و شر کے دو راستوں میں سے اس راستہ کو اختیار کرنے کی توفیق ملی جو اس کی زندگی کو کامیابی کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور ہدایت کا ملنا نہ ملنا تمام تر آدمی کے اپنے ارادے پر منحصر ہے۔ ہدایت دینے والا خدا ہے۔ اس کے سوا کہیں اور سے آدمی ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر خدا کی طرف سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کا طالب ہو۔ اس لیے قرآن کا مطالعہ اسی کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے اور کسی ایسے ہی شخص کو یہ توفیق ملتی ہے کہ قرآن اس کی زندگی میں داخل ہو جائے جس کو حقیقت کی تلاش ہو، جو واقعی صحیح معنوں میں ہدایت کی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر یہ عزم پیدا کر چکا ہو کہ حق اس کو جہاں اور جس شکل میں بھی ملے گا وہ اس کو لے لے گا اور اس سے چمٹ جائے گا۔ قرآن کا علم کسی درس گاہ کی سند کے طور پر آدمی کو نہیں ملتا، نہ کتب خانوں اور لائبریری کی الماریوں سے اس کو ذہن میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی کو ملتا ہے جو حقیقی معنوں میں قرآن کا طالب ہو۔ جس کے اندر اتنا حوصلہ ہو کہ ہر ذاتی رجحان کے مقابلہ میں حق کو ترجیح دے سکے جو قرآن کو کتاب الٰہی سمجھ کر اس کا مطالعہ کرے اور اس کے مقابلے میں اپنی وہ حیثیت قرار دے جو ایک بندے کی اپنے مالک کے فرمان کے مقابلے میں ہوتی ہے جب بندہ اپنے آپ کو خالی الذہن کر کے اپنے آپ کو قرآن کا مخاطب بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور قرآن کے مطالب اس کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں جیسے سوکھی زمین میں بارش ہو اور بوند بوند کر کے اس میں جذب ہوتی چلی جائے۔ (۹ ۷ ۱۳ھ)

دوسرا حصّہ
حفاظتِ قرآن

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

الحجر ۹

ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی
حفاظت کرنے والے ہیں۔

حفاظت قرآن

قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ سب سے پہلی آیت جو اتری وہ آیت علم (اقرأ باسم ربك الذی خلق) تھی اور آخری آیت آخرت (اتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ، بقرہ) ابتدائی ۲۳ سال تک خود رسول اللہ کی ذات قرآن کے اخذ کا ذریعہ تھی۔ اپنے بعد آپ نے کچھ لوگوں کو نامزد کر دیا کہ ان سے تم قرآن سیکھنا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے نہایت صحت کے ساتھ پورے قرآن کو اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا اور عربی زبان سے گہری واقفیت اور جناب رسول کی مسلسل صحبت کی وجہ سے اس قابل ہو گئے تھے کہ مستند طور پر قرآن کی تعلیم دے سکیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک شخص کوفہ سے مدینہ آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے آپ سے کہا کہ کوفہ میں ایک شخص یاد سے قرآن پڑھاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر غضب ناک ہو گئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ حضرت عبد اللہ بن مسعود ہیں، تو آپ خاموش ہو گئے (استیعاب، جلد ۱، صفحہ ۳۷۷) اس کی وجہ یہی تھی کہ عبد اللہ بن مسعود آنحضرت کے اجازت یافتہ تھے۔ آپ کے مجاز قاریوں میں سے چند نمایاں افراد یہ تھے —— عثمان، علی، ابی ابن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابو الدرداء، ابو موسیٰ اشعری، سالم مولی ابی حذیفہ۔

مگر یہ اجازت یافتہ افراد ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ اندیشہ بہر حال تھا کہ کسی وقت ایسے تمام لوگ ختم ہو جائیں اور قرآن دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر اختلاف کا شکار ہو جائے۔ جنگ یمامہ (۱۲ھ) کے بارہ میں خبر آئی کہ کثرت سے مسلمان قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر، خلیفہ اول ابو بکر صدیق کے پاس آئے اور کہا کہ اب قرآن کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس کو تحریری طور پر باضابطہ مدون کر دیا جائے۔ اس موقع پر روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

فلما قتل سالم، مولیٰ ابی حذیفۃ خشی عمر ان یذھب القرآن فجاء الی ابی بکر ...	جب سالم، مولی ابو حذیفہ قتل ہوئے تو عمر کو خطرہ پیدا ہوا کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے، وہ ابوبکر کے پاس آئے،

فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۹

یمامہ کی جنگ میں تقریباً ۷۰۰ صحابہ قتل ہوئے تھے۔ مگر حضرت عمر کو "ذہاب قرآن" کا خطرہ حضرت سالم کی موت کی وجہ سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان چند مخصوص صحابہ میں سے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

جیسا کہ ثابت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے اترتے ہی اس کو فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ کتابت کا اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ سورہ نساء آیت ۹۵ اتر چکی تھی بعد کو غیر اولی الضرر اس میں بطور اضافہ اترا۔ امام مالک کے الفاظ میں یہ "حرف واحد" (در منثور، جلد ۲، صفحہ ۲۰۳) بھی آپ نے اسی وقت کاتب کو بلا کر لکھوایا:

لما انزلت لایستوی القاعدون من المومنین	جب آیت لایستوی القاعدون الخ اتری تو رسول اللہ

غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ادع لی زید ادیجیٔ باللوح والقلم والکتف والدواۃ ثم قال اکتب لا یستوی ۔۔۔ (بخاری)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئیں۔ جب وہ آگئے تو کہا کہ لکھو لا یستوی ۔۔۔۔

آپ کا معمول تھا کہ نازل شدہ آیات کو لکھانے کے بعد اس کو پڑھوا کر سنتے۔ زید بن ثابت کا بیان ہے: فان کان فیہ سقط اقامہ (مجمع الزوائد، جلد ۱، صفحہ ۶۰) اگر کوئی جزء لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو درست کراتے جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا (ثم اخرج بہ الی الناس ۔۔۔) کاتبان وحی (وہ صحابہ جن سے آپ قرآن کو لکھواتے تھے) ان کی تعداد ۴۲ تک شمار کی گئی ہے۔ (ان ۴۲ کاتبوں کے نام کے لئے ملاحظہ ہو الکتانی کی کتاب التراتیب الادارید، جلد ۱، صفحہ ۱۱۶ مطبوعہ مراکش) ابن عبد البر نے عقد الفرید (جلد ۴، صفحہ ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ حنظلہ ابن ربیع رضؓ تمام کاتبوں کے "خلیفہ" تھے۔ یعنی ان کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت آپ کی صحبت میں موجود رہیں۔ آپ کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو کثرت سے لوگوں کے پاس قرآن کے اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ ایک تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے پاس مکمل قرآن اپنی اصل ترتیب کے ساتھ جمع شدہ موجود تھا۔ ان میں سے چار خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

مات النبی ولم یجمع القرآن غیر اربعۃ: ابو الدرداء ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت و ابو زید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو چار آدمیوں کے پاس مکمل قرآن تحریری طور پر موجود تھا: ابو الدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید

قرآن مکمل طور پر لکھا ہوا عہد نبوت میں موجود تھا۔ البتہ کتابی شکل میں ایک جگہ مجلد نہیں ہوا تھا۔ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے:

قد کان القرآن کلہ مکتوبا فی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد
الکتانی، جلد ۲، صفحہ ۳۸۴)

قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ البتہ ایک جگہ تمام سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا۔

حارث محاسبی نے، جو امام حنبل کے معاصر ہیں، اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے:

وکان القرآن فیہا منتشر افجمعہا جامع وربطہا بخیط

قرآن کی سورتیں اس میں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ ابوبکر کے حکم سے جامع (زید بن ثابت) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگہ سے سب کی شیرازہ بندی کی

قرآن کی کتابت تین مراحل سے گزری ہے: کتابت، تالیف، جمع۔

پہلے مرحلہ میں کوئی آیت یا سورۃ اترتے ہی اس کو کسی ٹکڑے پر لکھ لیا جاتا تھا، اس سلسلے میں حسب ذیل چیزوں کے نام آئے ہیں:

رقاع	چمڑا
لخاف	پتھر کی سفید پتلی تختیاں (سلیٹ)
کتف	اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی
عسیب	کھجور کی شاخ کی جڑ کا کشادہ حصہ

دوسرے مرحلہ کے عمل کو حدیث میں تالیف سے تعبیر کیا گیا ہے (کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نولف القرآن فی الرقاع، مستدرک حاکم) گویا اولاً ہر آیت نازل ہوتے ہی لکھ لی جاتی تھی۔ پھر جب سورہ مکمل ہو جاتی تو پوری سورہ کو مرتب شکل میں رقاع (چمڑے) پر لکھتے تھے۔ اس قسم کے مولفہ قرآن (مکمل یا غیر مکمل) دور نبوت ہی میں کثرت سے لوگوں کے پاس ہو چکے تھے۔ حضرت عمر کے اسلام لانے کے مشہور واقعہ میں ہے کہ بہن کو زدوکوب کرنے کے بعد آپ نے کہا وہ کتاب مجھے دکھاؤ جو ابھی تم پڑھ رہے تھے (اعطنی الصحیفۃ التی سمعتکم تقرؤن آنفا، ابن ہشام)۔ بہن نے جواب دیا: ناپاکی کے ساتھ تم اس کو چھو نہیں سکتے۔ پھر آپ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے کتاب انھیں دی (فاغتسل فاعطتہ الصحیفۃ)

تیسرے مرحلہ کے کام کو "جمع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی پورے قرآن کو ایک جلد میں یکجائی طور پر لکھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مختلف رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہوتا تھا۔ تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرنے کا طریقہ آپ کے عہد میں رائج نہ تھا۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق صرف چار صحابہ (ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید، زید بن ثابت) تھے جنھوں نے پورے قرآن کو آپ کے عہد میں مجموعی شکل میں تیار کر لیا تھا۔ تاہم ان کی حیثیت نجی مجموعوں کی تھی۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنز العمال میں جو روایت ہے، اس کے مطابق ایسے جامعین قرآن کی تعداد پانچ تھی، (جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسۃ من الانصار) حضرت ابوبکر صدیق نے جو کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے ریاستی انتظام کے تحت تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر مجلد کرا دیا۔ امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادہ سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے القراطیس پر ابوبکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا۔ بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے۔ ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیق کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو رَبعہ کہتے تھے (اتقان، جلد ا، صفحہ ۸۵-۸۴) ربعہ کا ترجمہ چوکھنٹا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق کا طول وعرض اغلباً متساوی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں مصر، عراق، شام اور یمن وغیرہ میں قرآن کے ایک لاکھ سے زیادہ نسخے موجود تھے۔

بعد کے زمانے میں لکھا ہوا قرآن ہی لوگوں کے لیے قرآن کو سیکھنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، تاہم ایک خطرہ اب بھی تھا۔ مقدس کتاب میں انتہائی معمولی فرق بھی زبردست اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ اندیشہ تھا کہ مختلف لوگ اگر اپنے اپنے طور پر قرآن لکھیں تو کتابت اور قرأت کا فرق مسلمانوں کے اندر زبردست اختلاف کھڑا کر دے گا اور اس کو ختم کرنے کی کوئی سبیل باقی نہ رہے گی۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں ایک ہی لفظ کو محض ادائگی کے فرق سے کوئی مالک یوم الدین لکھتا، کوئی ملک یوم الدین اور کوئی ملیک یوم الدین۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا، طرز تحریر اور رسم الخط کا فرق نئے نئے اختلاف پیدا کرتا چلا جاتا۔ اس لیے حضرت عمر کے مشورہ سے خلیفہ اول حضرت ابوبکر نے طے کیا کہ سرکاری اہتمام میں قرآن کا ایک مستند نسخہ لکھوا دیا جائے اور اختلاف قرأت کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اس کے لیے زید بن ثابت سب سے زیادہ موزوں شخص تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ کے کاتب (سکرٹری) تھے۔ زید اور ابی بن کعب دونوں "عرضہ اخیرہ" میں شامل تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پورے قرآن کو نبوی ترتیب کے ساتھ سنا تھا۔ ان کو پورا قرآن مکمل طور پر یاد تھا اور اس کے ساتھ پورا قرآن مرتب طور پر لکھا ہوا بھی ان کے پاس موجود تھا۔ خلیفہ اول نے ان کو حکم دیا کہ تم قرآن کا تتبع کرو اور اس کو جمع کر دو (فتتبع القرآن فاجمعہ، بخاری) اس بات کے طے ہونے کے بعد حضرت عمر نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی ٹکڑا موجود ہو، وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں قرآن "کاغذ"، یعنی چمڑے، پتھر اور کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا ہوا تو موجود تھا اور بہت سے لوگوں کے سینوں میں، رسول اللہ سے سن کر، مرتب طور پر بھی محفوظ تھا۔ مگر وہ ایک کتاب کی طرح بین الدفتین اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ اول نے حکم دیا کہ اس کو بین الدفتین جمع کر دو اور اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت میں یکجا کر دو:

وقال الحارث المحاسبی فی کتاب فہم السنن: کتابة القرآن لیست بمحدثة، فانه صلی اللہ علیه وسلم کان یامر بکتابته ولکنه کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخها من مکان الی مکان مجتمعا وکان ذلک بمنزلة اوراق وجدت فی بیت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیها منتشر فجمعها جامع وربط بخیط حتی لا یضیع منها شئ

الاتقان، جلد ۱، صفحہ ۴۰

حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھوایا کرتے تھے۔ مگر وہ رقاع اور اکتاف اور عسیب میں متفرق طور پر لکھا ہوا تھا۔ ابوبکر صدیق نے اس کو مرتب طور پر یکجا لکھنے کا حکم دیا۔ اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پائے گئے تھے۔ ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا۔ اسی کو جمع کرنے والے نے جمع کر دیا اور ایک دھاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن "جمع" نہ تھا اور آپ کے زمانۂ خلافت میں اس کو جمع کیا گیا۔ قرآن اس سے پہلے بھی مکمل طور پر جمع تھا۔ "عرضۂ اخیرہ" میں متعدد صحابہ کو شامل کر کے آپ نے اس کی تصدیق و توثیق بھی فرما دی تھی۔ جمع قرآن کا یہ اہتمام صرف اس لئے ہوا کہ معمولی امکانی فروق کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے جو حافظہ یا کتابت میں فرق کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے زید بن ثابت کو یہ آیت سنائی:

من المهاجرين والانصار الذين اتبعوهم باحسان (توبہ ۱۰۰)

زید نے کہا مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے، اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک "واو" بھی ہے۔ چنانچہ تحقیق شروع ہوئی بالآخر مختلف لوگوں کی گواہیوں سے ثابت ہوا کہ زید کی رائے صحیح تھی۔ چنانچہ مصحف میں آیت کو واؤ کے ساتھ لکھا گیا۔

مولانا بحر العلوم شرح سلم میں لکھتے ہیں "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ ان دس قاریوں نے جن کی قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اسی ترتیب سے نقل کیا۔

زید بن ثابت نے جب پورا قرآن مرتب کر لیا تو ان کے مصحف کے علاوہ جتنے مختلف اجزاء اکھٹا ہوئے تھے، ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔ یہ مجلد مصحف خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کے پاس رکھ دیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد وہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسلام بہت پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لئے قرآن سیکھنے کا ذریعہ وہ صحابہ تھے جو مدینہ سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ مثلاً اہل شام ابی بن کعب سے قرآن سیکھتے تھے۔ اہل کوفہ عبداللہ بن مسعود سے اور اہل عراق ابو موسیٰ اشعری سے۔ تاہم اختلاف لہجہ اور اختلاف کتابت کی وجہ سے دوبارہ لوگوں میں قرآن کے بارے میں اختلافات ہونے لگے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے (یکفر بعضهم بعضا، تبیان الجزائری)۔ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یزید بن معاویہ نخعی سے نقل کیا ہے کہ ولید بن عقبہ کے زمانہ میں ایک بار وہ کوفہ کی مسجد میں تھے۔ حذیفہ بن الیمان بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ مسجد میں ایک حلقہ قرآن کے ذکر میں مشغول تھا۔ ایک شخص نے کوئی آیت پڑھی اور کہا: قرأۃ عبداللہ بن مسعود۔ دوسرے نے اسی آیت کو کسی اور ڈھنگ سے پڑھا اور کہا قرأۃ ابی موسیٰ الاشعری۔ حضرت حذیفہ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا:

هكذا كان من قبلكم اختلفوا، والله لاركبن الى امير المومنين	تم سے پہلے جو لوگ تھے، انھوں نے اسی طرح اختلاف کیا۔ خدا کی قسم میں سوار ہو کر امیر المومنین (عثمان) کے پاس جاؤں گا۔

عمارہ بن غزیہ کی روایت کے مطابق حذیفہ بن الیمان واپس آئے۔ وہ ایک فوجی افسر تھے اور اس وقت آرمینیہ میں

اہل شام سے اور آذر بائیجان میں اہل عراق سے جنگ کر کے لوٹے تھے۔ وہ مدینہ پہنچے تو اپنے مکان جانے کے بجائے سیدھے خلیفہ ثالث کے پاس آئے اور کہا:

یا امیر المومنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاری

اے امیر المومنین لوگوں کو سنبھالئے، قبل اس کے کہ لوگ کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف میں پڑ جائیں جس طرح یہود و نصاری اختلاف میں پڑ گئے

حضرت عثمان کے زمانہ میں ایسی آبادیاں اسلام میں داخل ہوگئیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ عربی الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت ظاہر ہے ان میں نہیں ہوسکتی تھی۔ خود عرب کے مختلف قبائل کے لہجے الگ الگ تھے۔ اس سے قرأت قرآن میں اختلاف پیدا ہوا۔ نتیجۃً نقل و تحریر میں بھی اختلاف شروع ہوگیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنی ہذیل حتیٰ کو عتیٰ پڑھتا تھا۔ ابن مسعود اسی قبیلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حتیٰ حین کو عتیٰ عین پڑھتے تھے۔ قبیلہ بنو اسد تعلمون کی ت کو زیر کے ساتھ (تِعلمون) پڑھتا تھا۔ مدینہ کے لوگ تابوت کا تلفظ تابوہ کرتے تھے۔ قبیلہ قیس ک تانیث کا تلفظ ش سے کرتے تھے اور قرآنی آیت کو قد جعل ربش تحتش سریا پڑھتے۔ اسی طرح قبیلہ تمیم اَن کے لفظ کو عن کی شکل میں ادا کرتے تھے اور عسی اللہ عن یاتی بالفتح پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ س کو ت کی شکل میں ادا کرتا تھا اور اعوذ برب الناس ملک الناس الٰہ الناس پڑھتا تھا وغیرہ۔ ان حالات میں حذیفہ بن یمان صحابی کے مشورہ سے حضرت عثمان نے صدیقی نسخہ کی نقلیں تیار کرائیں اور تمام شہروں میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیج دیا۔ یہ کام دوبارہ حضرت زید بن ثابت انصاری کی سرکردگی میں کرایا گیا اور ان کی مدد کے لئے گیارہ افراد مقرر کئے گئے۔ خلیفہ سوم کے حکم کے مطابق اس کمیٹی نے قرآن کو قریش کے لہجہ پر تحریر کیا جو کہ پیغمبر اسلام کا لہجہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ دوسرے نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھے ہیں وہ ان کو حکومت کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ ان کو جمع کر کے نذر آتش کر دیا گیا۔

اس طرح قرآن کو لکھاوٹ یعنی نوشت و کتابت کی حد تک ایک بنا دیا گیا۔ تاہم فطری اختلاف کی وجہ سے سارے لوگ ایک طرح قرآن کو پڑھنے پر قادر نہ ہوسکتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو آزادی دے دی گئی کہ "سات" طریقوں یعنی متعدد لب و لہجہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ صدیق اکبر کا جمع قرآن آنحضرتؐ کی وفات کے ایک سال بعد انجام پایا تھا، عثمانی مصحف کی ترتیب آپؐ کی وفات کے پندرہ سال بعد ہوئی۔

تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے:

المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذلك انما حمل عثمان الناس علی القرأة لوجه واحد

لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ لوگوں کو قرآن کی ایک قرأت پر جمع کر دیا۔

بعض لوگوں نے تفنن طبع یا عناد کے طور پر اس قسم کی باتیں مشہور کیں کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں۔ مثلاً قرآنی آیت قفوهم انهم مسئولون (صافات) کے آخر میں عن ولایۃ علی کے الفاظ تھے، جنھیں عہد

عثمانی میں بالقصد قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے یہ مضحکہ خیز بات مشہور کی کہ "ولایت" کے نام سے ایک مستقل سورہ قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ اس کو قرآن سے نکال دیا گیا، اس قسم کی باتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان علینا جمعہ (قیامۃ) شیعہ وسنی دونوں کے نزدیک بالاتفاق قرآن کی آیت ہے۔ پھر قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہوئے کیسے کوئی شخص اس قسم کی بے بنیاد باتوں کو مان سکتا ہے۔ مشہور شیعی عالم علامہ طبرسی نے لکھا ہے:

الزیادۃ فی القرآن مجمع علیہ بطلانہا، واما النقصان فقد روی عن قوم من اصحابنا وعن قوم من حشویۃ العامۃ، والصحیح خلاف ذالک

قرآن میں اضافہ (شیعہ وسنی دونوں کے) اجماع سے غلط ہے۔ باقی کمی تو بعض شیعوں سے اور عامہ کے حشویہ (یعنی اہل سنت کے محدثین) سے اس کا دعویٰ منقول ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی محققین نے اس قسم کے دعوے نہیں کیے۔ یہ موقع پرستوں کے شوشے تھے جو انھوں نے سیاسی مقصد کے لئے وضع کیے۔ اہل بیت کی فضیلت کی ساری موضوعات اس لئے گھڑی گئیں تاکہ ان کے لئے خلافت کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک غیر معروف شخص محمد بن جہم الہلالی تھے۔ انھوں نے امام جعفر صادق کی طرف منسوب کرکے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت امۃ ھی اربیٰ من امۃ (نحل) میں تحریف کی گئی ہے۔ اصل الفاظ تھے ائمتنا ھی ازکیٰ من أئمتکم (تفسیر روح المعانی مقدمہ) یعنی ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ وحکمراں بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت عثمان نے ۲۵ھ میں حفصہ بنت عمر کے پاس سے مصحف صدیقی منگوایا۔ اس وقت قرآن کے کاتب اول زید بن ثابت انصاری موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں آپ نے بارہ آدمیوں کی جماعت مقرر کی۔ انھوں نے صدیقی نسخہ کی بنیاد پر قرآن کی سات نقلیں تیار کیں۔ پھر یہ نسخے تمام اسلامی ملکوں میں بھیج دیئے گئے۔ حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کے سوا جتنے مصاحف لوگوں نے بطور خود لکھ لئے ہیں وہ سب جلا دیئے جائیں۔ ایک نسخہ انھوں نے دارالسلطنت مدینہ میں رکھا اور اس کا نام "الامام" رکھا اور بقیہ ہر گوشہ مملکت میں بھیج دیا۔ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں سے ہر جگہ ایک ایک نسخہ بھیجا۔

یہ مصحف بعد کی صدیوں میں انتہائی صحت کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ دور پریس میں پہنچ گیا جس کے بعد کسی ضیاع یا تغیر کا کوئی سوال نہیں۔ اس ابتدائی نسخہ کے ساتھ بعد کے نسخوں کی مطابقت کا کتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس کی دو چھوٹی سی مثال لیجئے۔ سورہ مومنوں کی آیت ۱۰۸ میں قال (الف کے ساتھ) لکھا ہوا ہے یہی لفظ اسی سورہ کی اگلی آیت ۱۱۲ میں قل (بغیر الف) لکھا گیا ہے۔ گویا ابتدائی مصحف میں جو لفظ جس شکل میں لکھا ہوا تھا ٹھیک اسی طرح اس کو لکھا جاتا رہا۔ خواہ ایک ہی لفظ، دو جگہ دو املا کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سورہ قیامہ کی آیت "وقیل من" کے بعد قاری تھوڑی دیر وقفہ کے لئے ٹھہرتا ہے۔ پھر "راق" پڑھتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہلکا وقف کیا تھا۔ قرآن میں اس طرح کے دوسرے متعدد

مقامات ہیں، مگر کبھی قرآن پڑھنے والوں کو یہ خیال نہیں ہوا کہ بطور خود دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح وقفہ دے کر پڑھنا شروع کر دیں۔

آج جو قرآن مسلمانوں کے درمیان رائج ہے، اس کی صحت میں کسی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں۔ حتیٰ کہ محقق شیعہ علماء بھی اس معاملہ میں متفق ہیں۔ کتاب تاریخ القرآن لابی عبداللہ الزنجانی شیعی (صفحہ ۴۶) میں نقل کیا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف بابن طاؤس (۶۶۴ — ۵۸۹ھ) جو محقق شیعہ علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب سعد السعود میں شہرستانی سے نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں سوید بن علقمہ سے روایت کیا ہے:

قال سمعت علی بن ابی طالب یقول: ایھا الناس، اللہ اللہ، ایاکم والغلو فی امر عثمان وقولکم حراق المصاحف۔ فواللہ ما حرقھا الاعن ملأ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعنا وقال: ما تقولون فی ھذہ القرأۃ التی اختلف الناس فیھا، یلقی الرجلُ الرجلَ فیقول: قرأتی خیر من قرأتك، وھذا یجر الی الکفر، فقلنا مالرأی، قال ارید ان اجمع الناس علی مصحف واحد، فانکم ان اختلفتم الیوم کان من بعد کم اشد اختلافا، فقلنا نعم ما رأیت

وہ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اے لوگو، اللہ اللہ، عثمان کے معاملہ میں غلو سے بچو۔ یہ نہ کہو کہ انھوں نے مصاحف کو جلایا۔ خدا کی قسم انھوں نے نہیں جلایا مگر اس وقت کہ انھوں نے صحابہ کی جماعت کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ تم قرآن میں اختلاف قرأت کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ ایک شخص دوسرے سے ملتا ہے اور کہتا ہے۔ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے۔ اس قسم کی بات کفر تک جاتی ہے۔ صحابہ نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دوں۔ کیوں کہ تم اگر آج اختلاف میں پڑ گئے تو تمھارے بعد کے لوگ اور زیادہ اختلاف میں پڑیں گے۔ تمام صحابہ نے کہا ہاں آپ کی رائے سے ہم کو اتفاق ہے۔

قرآن کا یہ ایسا وصف ہے جس کا معاندین تک نے اعتراف کیا ہے۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"محمد کی وفات کے ربع صدی بعد ہی ایسے منافشات اور فرقہ بندیاں ہوگئیں جس کے نتیجہ میں عثمان قتل کر دیے گئے، اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں۔ مگر ان سب فرقوں کا قرآن ایک ہی ہے۔ ہر زمانہ میں یکساں طور پر سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا، اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی مصحف ہے جو اس بدقسمت خلیفہ (عثمان) کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔ شاید پوری دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں ہے جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی ہو" لائف آف محمد (۱۹۱۲) دیباچہ

لین پول نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں، اس پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے (سلکشن فرام دی قرآن)

جرمن محقق وان ہیم غیر مسلم مستشرقین کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں"

اعجاز التنزیل صفحہ ۵۰

عہد عثمانی تک قرآن کے جتنے نسخے لکھے گئے وہ سب خط حیری میں تھے۔ حضرت علی کے زمانہ میں خط کی اصلاح ہوئی اور خط کوفی وجود میں آیا جو سابق خط کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ حضرت علی کے ندیم خاص ابوالاسود الدولی (۶۹ھ) نے پہلی بار اس خط کو بنایا اور پھر بنی امیہ کے عہد میں اس کو مزید ترقی ہوئی۔ قرآن میں اعراب لگانے کا آغاز بھی ابوالاسود دولی نے حضرت علی کے عہد میں کیا۔ اسی کی بنیاد پر حجاج بن یوسف نے بعد کو قرآن کے باقاعدہ معرب نسخے تیار کرائے۔ آج تک قرآن ٹھیک اسی نہج پر لکھا جا رہا ہے۔

کتاب محفوظ

ایک کاتب صاحب کو ایک کتاب کا مسودہ کتابت کے لئے دیا گیا۔ اس مسودہ میں ایک جگہ محدث ابو دعاد کا نام تھا۔ کاتب صاحب ابو دعاد سے واقف نہ تھے۔ البتہ وہ ابوداؤد کو جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابودعاد کی جگہ ابوداؤد لکھ دیا۔ اسی طرح ایک مضمون میں ایک جگہ ہیلی کاپٹر کا لفظ تھا۔ کاتب صاحب اس کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اصل لفظ کی جگہ املی کا پیڑ لکھ دیا۔

اس قسم کی غلطیوں کی مثالیں بہت عام ہیں۔ ایک آدمی کسی مضمون کو پڑھ رہا ہے یا اس کو نقل کر رہا ہے۔ اس درمیان میں ایک ایسا جملہ آتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ اس کو وہ اپنے ذہن کے مطابق بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو کسی ذاتی غرض کے تحت اصل متن میں بالقصد تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں ایسی باتیں شامل کر دیتے ہیں جو اصل کتاب میں اس کے مصنف نے شامل نہ کی تھیں۔

پچھلی آسمانی کتابوں میں جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی وجہ انسان کی یہی کمزوری ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو سات دنوں (ایام) میں پیدا کیا۔ یہی بات بائبل میں اس طرح ہے کہ ساتوں دن کی الگ الگ تفصیل ہے۔ ہر دن کی تخلیقات کا ذکر کرنے کے بعد اس میں یہ فقرہ ملتا ہے "اور شام ہوئی اور صبح ہوئی"۔ یہ فقرہ یقینی طور پر مذکورہ بالا ذہن کے تحت انسان کا اضافہ ہے۔ کسی بزرگ نے بطور خود بائبل کے جملہ کو مکمل کرنے کے لئے یہ الفاظ بڑھا دیئے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ گنجائش ہے کہ دن کو دور (Period) کے معنی میں لے سکیں۔ مگر بائبل میں مذکورہ فقرہ کے اضافہ نے اس کو دور کے معنی میں لینا ناممکن بنا دیا۔

بائبل میں اس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مثالیں نہایت بھونڈی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اپنا ہاتھ نکالیں تو وہ چمکنے لگے۔ مگر بائبل میں اس کا ذکر ہے تو وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔ اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (خروج ۴:۶) بائبل کے اس فقرہ میں "کوڑھ سے" یقینی طور پر بعد کے لوگوں کا تشریحی اضافہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے مطابق حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا چمکنا خدائی سبب سے معلوم ہوتا ہے اور بائبل کے الفاظ کے مطابق مرض کے سبب سے۔

قرآن تمام آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان کتابوں کے حامل انسانوں پر ڈالی گئی تھی۔ اسی لئے قرآن میں ان کے لئے استحفاظ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی حفاظت چاہنا (بما استحفظوا من کتاب اللہ) اس کے برعکس قرآن کے بارہ میں حافظ کا لفظ آیا ہے یعنی حفاظت کرنے والا (انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون)

قرآن میں ایسے بہت سے مواقع تھے جہاں حاملین قرآن کے لئے گنجائش تھی کہ وہ اس میں مذکورہ بالا قسم کی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے عملاً ایسا کیا بھی مگر انھوں نے جو کچھ کیا وہ "حاشیہ" کی حد تک محدود رہا۔ "متن" میں وہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ حاشیہ اور تفسیر میں چونکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ تھے، اس لئے اس میں انھوں نے طرح طرح کی معصومانہ تبدیلیاں کر دیں۔ مگر جہاں تک متن کا تعلق ہے، اس کو خدا نے براہ راست اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا، اس لئے یہاں وہ کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے سے قاصر رہے۔

اس موقع پر وضاحت کے لئے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ قرآن کی پہلی نزولی آیت ہے: اقرأ باسم ربك الذی خلق (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) اسی طرح دوسرے مقام پر ہے سنقرئك فلا تنسی (ہم تجھ کو پڑھا دیں گے پھر تو نہ بھولے گا) ان آیات میں اقرأ اور سنقرأ کے الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی کتاب یا کوئی لکھی ہوئی چیز رکھی گئی اور کہا گیا کہ اس کو پڑھو۔

یہ بات مسلمانوں کے عام عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ امی تھے۔ گویا آیت کے یہ الفاظ اپنے ظاہر کے اعتبار سے مسلمانوں کے عقیدہ میں مانع ہیں اور مخالفین اسلام کو غیر ضروری طور پر یہ کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امی نہیں تھے بلکہ پڑھے لکھے تھے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ دوسری کتابوں کے متن کی طرح مسلمان قرآن کے ان الفاظ کو بدل دیں۔ یہ قرآن کے محفوظ کتاب ہونے کا ایک واضح داخلی ثبوت ہے۔ ورنہ اگر دوسری کتابوں کی طرح کا معاملہ ہوتا تو قرآن میں ہم کو اقرأ کی جگہ اُتْلُ یا تَلَفَّظْ لکھا ہوا ملتا۔ اسی طرح لکھنے والوں نے سنقرئك کے بجائے سنحفظك لکھ دیا ہوتا۔

اسی طرح ایک مثال سورہ قیامۃ کی آیت وقیل من راق (اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک والا) ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان جب اس آیت کو پڑھتے ہیں تو وہ مَنْ پر وقفہ کرتے ہیں۔ یعنی مَنْ کے بعد کسی قدر رک کر راق کہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے والے اصحاب نے بیان کیا کہ آپ نے جب یہ آیت پڑھی تو آپ نے حرف مَنْ پر وقفہ کیا۔ ورنہ نحو وصرف کے فن کے اعتبار سے اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے کہ یہاں یہ وقفہ کیوں کیا جائے۔ اگر قرآن کے ساتھ اس کے حاملین وہ معاملہ کرسکتے جو دوسری کتابوں کے ساتھ اس کے حاملین نے کیا تو لازماً ایسا ہوتا کہ یہ وقفہ باقی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں مسلمان اس کو وقیل من راق پڑھتے نہ کہ وقیل من (سکتہ) راق۔

اسی طرح قرآن میں ہے: یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء (اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو) یہ جملہ نحو وصرف کے عام قاعدہ کے خلاف ہے۔ اس میں واحد سے خطاب کرکے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ عام لکھنے اور بولنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اگر قرآن کا وہ معاملہ ہوتا جو دوسری آسمانی کتابوں کا ہے تو یقینی طور پر ایسا ہوتا کہ کچھ مسلمان اس آیت کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ چکے ہوتے:

یاایہاالنبی اذا طلقت النساء، یا یا ایہا الرسل اذا طلقتم النسآء۔

یہی معاملہ طرز تحریر کا ہے۔ عربی فن خطاطی نے بعد کے زمانہ میں بہت ترقی کی۔ جبکہ قرآن اس وقت لکھا گیا جب کہ فن خطاطی نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ قرآن کے طرز کتابت میں اور عام خطاطوں کے طرز کتابت میں بہت سے مقامات پر فرق ہے۔ مثلاً قرآن میں مالك کو مٰلك لکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس طرز کتابت کی وجہ سے آیت کے دو تلفظ بن گئے ہیں۔ کوئی اس کو مالِكِ یوم الدین پڑھتا ہے اور کوئی اس کو مَلِكِ یوم الدین پڑھتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ آیت کا املاء بدل کر اس کو مالك یوم الدین بنادے۔

قرآن کے حاشیہ میں بعد کے لوگوں نے جو معنوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: انی جاعل فی الارض خلیفة (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) بعد کے متعدد مفسرین نے اس آیت میں خلیفہ کے لفظ کو خلیفة اللہ کے ہم معنی بنادیا اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ —— خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ حالانکہ "اپنا" کا لفظ یہاں سراسر اضافہ ہے۔ ان حضرات نے حاشیہ میں تو اس قسم کے اضافے خوب کئے مگر متن میں اضافہ کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ اگر قرآن کے متن پر خدا کا پہرہ نہ ہوتا تو غالباً وہ آیت کے الفاظ کو ناکافی سمجھ کر اس کو اس طرح لکھ دیتے:

انی جاعل فی الارض خلیفتی یا انی جاعل فی الارض خلیفة منی

دوسری آسمانی کتابوں میں سے ہر کتاب میں یہ ہوا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے اپنے

طور پر جو کچھ چاہتے تھے وہ سب انھوں نے خدا کی کتاب میں کہیں نہ کہیں داخل کر دیا۔ مثال کے طور پر یوحنا کی موجودہ انجیل میں ہم کو یہ فقرہ ملتا ہے:

"دوسرے دن اس نے یسوع کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا، دیکھو یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے جو مجھ سے مقدم ٹھہرا ہے کیونکہ وہ مجھ سے پہلے تھا" (یوحنا باب ۱)

انجیل یوحنا کا یہ فقرہ حضرت یحییٰ کی زبان سے حضرت مسیح کے بارہ میں ہے۔ حضرت یحییٰ کی یہ تقریر بقیہ تینوں انجیلوں میں بھی ہے مگر ان میں "جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے" موجود نہیں۔ یہ الفاظ یقینی طور پر بعد کو اصل تقریر میں اس لئے بڑھائے گئے تاکہ ان سے کفارہ کا عقیدہ نکالا جاسکے۔ بعد کے مسیحیوں کا پسندیدہ عقیدہ (کفارہ) کو انجیل سے ثابت کرنے کے لئے حضرت یحییٰ کی مذکورہ تقریر میں یہ جملہ بڑھا دیا گیا۔ حالانکہ وہ اگر حضرت یحییٰ کا جملہ ہوتا تو وہ چاروں انجیلوں میں موجود ہوتا۔

یہی بات قرآن میں بھی ہوسکتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے انتہائی محبوب عقیدے بھی قرآن کے متن کے اندر موجود نہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیا ہونا اور خدا کے یہاں آپ کا شفیع المذنبین ہونا مسلمانوں کے محبوب ترین عقائد ہیں۔ مگر قرآن میں کسی مقام پر وہ واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔ مسلمان یہ تو کر سکے کہ اپنے ان عقائد کو بعض آیات سے بطریق استنباط نکالیں۔ مگر وہ ان کو متن قرآن میں داخل نہ کر سکے۔ اگر مسلمانوں کو متن میں تصرف کی قدرت حاصل ہوتی تو یقیناً آج ہم قرآن میں کوئی ایسی آیت پڑھتے جس کے الفاظ یہ ہوتے:

یا محمدؐ انت افضل الانبیاء و انت شفیع المذنبین یوم القیامۃ

یہ چند سادہ قسم کی داخلی مثالیں ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن آج بھی اسی ابتدائی حالت میں موجود ہے جس حالت میں اس کے پیغمبر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے زمانہ میں لکھوایا تھا۔ اس میں کسی قسم کا معمولی تغیر بھی نہ ہوسکا۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن جب واحد آسمانی کتاب ہے جس کا متن پوری طرح محفوظ ہے تو اسی کا حق ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے لئے واحد رہنما کتاب بنے جو وحی الٰہی کو مانتے ہیں اور خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ محفوظ اور غیر محفوظ دونوں قسم کی کتابوں کی موجودگی میں یقینی طور پر محفوظ کتاب کی پیروی کی جائے گی۔ نہ کہ غیر محفوظ اور تبدیل شدہ کتاب کی۔

خدائی اہتمام

یہود کو خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ تورات کی حفاظت کریں (بما استحفظوا من کتب اللہ، المائدہ) اس کے برعکس قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (وانالہ لحفظون، الحجر) اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کی قوموں پر ڈالی گئی تھی، جب کہ قرآن کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ پچھلی آسمانی کتابیں بھی اسی طرح خدا کی کتاب تھیں جس طرح قرآن خدا کی کتاب ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کے حامل ان کتابوں کی حفاظت کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکے۔ یہ کتابیں اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود لی تھی اس لئے قرآن خدا کی خصوصی مدد سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان سے خدا کے فرشتے اتریں گے اور وہ قرآن کو اپنے سایہ میں لئے رہیں گے۔ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اخروی حقیقتوں کو غیب میں رکھا گیا ہے۔ اس لئے یہاں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ فرشتے سامنے آکر قرآن کی حفاظت کرنے لگیں۔ موجودہ دنیا میں اس قسم کا کام ہمیشہ معمول کے حالات میں کیا جاتا ہے نہ کہ غیر معمولی حالات میں۔ یہاں قرآن کی حفاظت کا کام تاریخی اسباب اور چلتے پھرتے انسانوں کے ذریعہ لیا جائے گا تاکہ غیب کا پردہ باقی رہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خدا نے اپنے وعدہ کو پوری تاریخ میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مختلف قوموں سے مدد لی ہے۔ نیز اس کام میں مسلمانوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے اور غیر مسلموں کو بھی۔

پچھلے انبیاء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کو بہت کم ایسے ساتھی ملے جو ان کے بعد ان کی کتاب کی حفاظت کی مضبوط ضمانت بن سکتے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ نمایاں طور پر دوسرے انبیاء سے مختلف ہے۔ وفات سے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے آپ نے حج کیا جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان موجود تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت تک آپ کے اوپر ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کی کل تعداد کم از کم پانچ لاکھ ہو چکی ہوگی۔ یہ تعداد قدیم انسانی آبادی کے لحاظ سے بہت غیر معمولی ہے۔ آپ کے بعد یہ تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ملک کے ملک مسلمان ہوتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کی پشت پر اتنا بڑا انسانی گروہ اکھٹا کر دیا گیا جو اس سے پہلے کسی آسمانی کتاب کی حفاظت کے لئے اکھٹا نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد دوسرا مددگار واقعہ یہ ظہور میں آیا کہ عرب میں اور عرب کے باہر مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ

شروع ہوا۔ یہ سلسلہ یہاں تک پھیلا کہ قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلمان قابض ہوگئے اور انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے مضبوط سلطنت قائم کی۔ یہ سلطنت کسی طاقت سے مغلوب ہوئے بغیر مسلسل قائم رہی اور قرآن کی حفاظت کرتی رہی۔ یہ سلسلہ ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمانہ پریس کے دور میں پہنچ گیا اور قرآن کے ضائع ہونے کا امکان سرے سے ختم ہوگیا۔

پریس کے دور میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی کتاب کا ایک نسخہ لکھا جائے اور اس کو چھاپ کر ایک ہی قسم کے کروروں نسخے تیار کرلئے جائیں۔ مگر پہلے ایسا ممکن نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں کتاب کا ہر نسخہ الگ الگ ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے اکثر ایک نسخہ اور دوسرے نسخہ میں کچھ نہ کچھ فرق ہوجاتا تھا۔ چنانچہ قدیم کتابوں میں سے جو کتاب بھی آج دنیا میں پائی جاتی ہے اس کے مختلف قلمی نسخوں میں سے کوئی بھی دو نسخہ ایسا نہیں جو فرق سے خالی ہو۔ یہ صرف قرآن ہے جس کے لاکھوں نسخے قدیم زمانہ میں ہاتھ سے لکھ کر تیار کئے گئے۔ ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی میوزیم اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ مگر ایک قلمی نسخہ اور دوسرے قلمی نسخہ میں کوئی ادنیٰ فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ خدا کی خصوصی مدد تھی جس نے قرآن کے بارے میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ مستعد اور حساس بنادیا

اسی کے ساتھ خدا نے یہ انتظام کیا کہ قرآن کے حفظ (رٹ کر اس کے متن کو یاد کرنے) کا نادر طریقہ شروع ہوا جو اس سے پہلے معلوم تاریخ میں کبھی کسی کتاب کے لئے نہیں کیا گیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دل میں یہ جذبہ ابھر آیا کہ وہ قرآن کے متن کو شروع سے آخر تک یاد کریں اور یاد رکھیں۔ اس طرح کے افراد تاریخ کے ہر دور میں ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ قرآن کے زمانہ سے شروع ہوکر آج تک جاری ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق دنیا میں کوئی بھی دوسری کتاب نہیں ہے جس کے ماننے والوں نے اس طرح اس کو یاد کرنے کا اہتمام کیا ہو جس طرح قرآن کے ماننے والے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔ قرآن کو یاد کرنے کے رواج نے اس کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام کو ممکن بنادیا جس کو ایک فرانسیسی مستشرق نے دہرا جانچ (Double Checking) کا طریقہ کہا ہے۔ یعنی ایک لکھے ہوئے نسخہ کو دوسرے لکھے ہوئے نسخہ سے ملانا اور اسی کے ساتھ حافظہ کی مدد سے اس کی صحت کو جانچتے رہنا۔

ڈیڑھ ہزار برس کی اسلامی تاریخ میں یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ہوا۔ امتحانی حالات کو باقی رکھنے کے لئے اگرچہ اس کو اسباب کے پردہ میں انجام دیا گیا ہے۔ تاہم جب قیامت آئے گی اور تمام حقیقتیں برہنہ کردی جائیں گی اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ عرب کے اسلامی انقلاب سے لے کر دور پریس کے نئے حفاظتی طریقوں تک سارے کام خدا خود براہ راست انجام دیتا تھا اگرچہ ظاہری طور پر وہ کچھ ہاتھوں کو اس کا ذریعہ بناتا رہا۔

قرآن کے بارے میں خدا کے اس خصوصی انتظام کا ایک اور اہم پہلو ہے جس کا تعلق مخصوص طور پر مسلمانوں

سے ہے۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے یہی دراصل وہ چیز نہیں ہے جو قرآن کے سلسلے میں اللہ کو ہم سے مطلوب ہو۔ یہ کام تو خود خدا کے براہ راست اہتمام میں ہو رہا ہے، پھر ہمارا اس میں کیا کمال۔ جو لوگ اس حفاظتی کام میں مشغول ہیں وہ اپنے اخلاص کے بقدر اپنا معاوضہ پائیں گے۔ مگر یہی امت مسلمہ کی اصل ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام خواہ کتنے ہی اخلاص کے ساتھ اور کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، اس سے ہماری اصل ذمہ داری ساقط نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی قوموں کا امتحان حفاظت متن میں تھا، امت مسلمہ کا امتحان حفاظتِ معانی میں ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو لوگ کتاب خداوندی کے حامل بنائے گئے ان کی آزمائش معانی کی حفاظت کے ساتھ یکساں طور پر متن کی حفاظت میں بھی تھی۔ مگر مسلمانوں کی آزمائش سب سے بڑھ کر معانی کی حفاظت میں ہے۔ مسلمانوں کو قرآن کے سلسلے میں جس چیز کا ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ قرآن کی تشریح و تعبیر میں فرق نہ کریں۔ قرآن میں جس چیز کو جس درجہ میں رکھا گیا ہے اس کو اسی درجہ میں رکھیں۔ وہ قرآن کے نشانہ میں کوئی تفسیری تبدیلی نہ کریں۔ قرآن کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ اسی اصل بات کو پیش کریں جو خود قرآن میں عربی زبان میں اتاری گئی ہے نہ کہ اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ ایک نیا دین بنائیں اور اس کو قرآن کے نام پر لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگیں۔

مسلمانوں کا قرآن کا حامل بننے میں ناکام ہونا یہ ہے کہ وہ قرآن کو برکت اور ثواب کی کتاب بنادیں اور اپنے دین کی گاڑی عملاً دوسری دوسری بنیادوں پر چلانے لگیں۔ کوئی مسائل کے نام پر سرگرمی دکھانے لگے اور کوئی فضائل کے نام پر۔ کوئی بزرگوں کے ملفوظات اور کہانیوں کو دین کی بنیاد بنائے اور کوئی جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچانے کو۔ کوئی قرآن کو اپنی سیاسی تحریک کا ضمیمہ بنائے اور کوئی اپنے قومی ہنگاموں کا۔ قرآن کے نام پر یہ تمام سرگرمیاں قرآن کے معانی میں تحریف کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلمان اگر قرآن کے معانی کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کر رہے ہوں تو وہ صرف اس بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے کہ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور تکرار میں انھوں نے کمی نہیں کی تھی۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ کتاب الٰہی کی حامل دوسری قوموں کو جو سزا متن کتاب کی تبدیلی پر دی گئی وہ سزا مسلمانوں کو معانی کتاب کی تبدیلی پر ملے گی۔ مسلمانوں کا اصل امتحان جہاں ہو رہا ہے وہ یہی ہے۔ اگر وہ کتاب اللہ کے معانی کو اپنی خود ساختہ تعبیرات سے بدل ڈالیں تو وہ صرف اس لئے خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے کتاب کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ کیونکہ امتحان آدمی کے اپنے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو جہاں اختیار حاصل ہے وہ قرآن کے معانی میں تبدیلی ہے نہ کہ قرآن کے متن میں تبدیلی۔ متن قرآن میں تبدیلی سے تو خدا نے تمام قوموں کو عاجز کر رکھا ہے، پھر وہاں کسی کا امتحان کس طرح ہوگا۔

تیسرا حصہ

دعوتِ قرآن
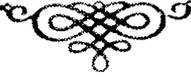
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً

النحل ۸۹

اور ہم نے تمہارے اوپر قرآن اتارا بیان کرنے والا ہر چیز کا
اور ھدایت اور رحمت ۔

منصوبہ خداوندی

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملتِ آدم میں شرک کا غلبہ ہوگیا (البقرہ ۲۱۳) حضرت نوح اسی ملت آدم کی اصلاح کے لئے آئے جو اس وقت دجلہ اور فرات کے سرسبز علاقہ میں آباد تھی۔

تاہم حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لئے تیّار نہ ہوئی۔ ان میں سے صرف چند آدمی تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔ اس کے بعد ملت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون ۴۴) مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتی کہ تمام پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بنالیا گیا (یٰسین ۳۰)

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اس زمانہ کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات قومی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہو وہ شرک کی فضا میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوجانے سے تعبیر کیا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعا میں ان الفاظ میں ملتی ہے: **ولا یلدوا الا فاجراً کفّاراً** (نوح ۲۷)

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ ۲۰۰۰ قبل مسیح ہے۔ خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالٰی نے انسان کی ہدایت کے لئے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصی اہتمام کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہوکر پرورش پائے۔ اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لئے توحید کو قبول کرنا آسان ہوجائے۔ پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر

قدیم مکہ کے غیر آباد علاقہ میں جائیں۔ اور وہاں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو بسا دیں۔ یہ علاقہ وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں بالکل غیر آباد تھا۔ اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔ حضرت ابراہیم کی دعا (ابراہیم ۳۷) میں عند بیتك المحرم سے یہی چیز مراد ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا، میں نے اپنی اولاد کو ایک بالکل غیر آباد علاقہ میں بسا دیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہوتی ہے، راقم الحروف ایک ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ اردو بولتے تھے۔ میں بھی اردو بولتا ہوں اور میرے بچوں کی زبان بھی اردو ہے۔ اب یہ ہوا کہ میرے ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقہ میں رہائش اختیار کر لی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس لڑکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لندن گیا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان بچوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات ۱۰۲) دکھایا گیا وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے جی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیر عمل لایا جا سکتا تھا جہاں اسباب حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو۔ حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبہ کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ چوں کہ اسباب کے دائرہ میں زیر عمل لانا تھا اس لئے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی رہی۔

حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی اس کی جانچ کے لئے مکہ جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف ہاجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے کچھ خانہ بدوش افراد یہاں آکر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بار فلسطین سے چل کر مکہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غیّر عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کا پیغام تمثیل کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کر لوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کر لی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی ماں بن سکے۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ مکہ آئے۔ اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔ اس سے حال پوچھا تو اس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا اسلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثبت عتبة بابك) حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبہ سے مطابقت کر کے رہ سکے اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح صحرائے عرب کے الگ تھلگ ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک الفطرة اور دوسرے المروءة۔

صحرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔ کھلے بیابان، اونچے پہاڑ، رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے وغیرہ۔ اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور کارگیری کی یاد دلاتے تھے۔ اسی خالص ربانی ماحول میں پرورش پا کر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم

کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ ۱۲۸) بن سکے یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لئے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لئے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے جس کو عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ ماحول میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کار آمد ہوسکتے تھے۔ وہاں بیرونی ماحول میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور پر ایسا ہوتا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیروؤں کی ایک ایسی نرسری (Nursery of heroes) میں تبدیل ہوگیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

چھٹی صدی عیسوی میں وہ وقت آگیا تھا کہ تاریخ میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم) پیدا کردیے گئے۔ جن کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (الصف) یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبہ کے مقام سے ہٹادیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کر دیں۔ اس غلبہ سے مراد اصلاً فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی مہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہوگی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبہ کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جد وجہد کے بعد ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۱۱۰) میں ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف وہ اپنی تخلیقی فطرت پر قائم تھا۔ دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو اخلاقی کردار یا مردانہ اوصاف کہا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورہ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشرکانہ سلطنتیں تھیں۔ ایک رومی (بازنطینی) سلطنت، دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔ اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، انھیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔ توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لئے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیش آنا لازمی تھا۔ خدا نے یہ کیا کہ عین اسی زمانہ میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تہس نہس کرکے ان کی مملکت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

اس سلسلے میں یہاں پروفیسر ہٹی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> The enfeebled condition of the rival Byzantines and Sasanids who had conducted internecine against each other for many generations, the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and undermining their sense of loyalty., ------- all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms.
>
> Philip K. Hitti, *History of the Arabs,* London 1970, p. 142–43

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسل تک جاری رہا۔ اس کا خرچ پورا کرنے کے لئے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور

ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبیعی واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لئے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔

ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں " اسلام " کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبہ کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب توہماتی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی امتیاز کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی حکمرانی کی جگہ جمہوری حکمرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تسخیر کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس مشہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ خدایا، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا (ابراہیم ۳۶)

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (اصنام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو مہذب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس

سورج، چاند اور ستارے ہر آنکھ کو جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگمگاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے فریب میں آگئے اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکر پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتیں بھی انھیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت غلبۂ توحید کا جو منصوبہ بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں قاتلوهم حتى لاتكون فتنة و يكون الدين كله لله (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارح ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کو جارحیت کا موقع اس لئے حاصل تھا کہ اس زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہو گئی تھی۔ شرک کو مکمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے حکمرانوں کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ یہ دعوت ان کے حق حکمرانی کو مشتبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ قدیم زمانہ میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم برداران شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاتمہ کر دو کہ وہ داعیان توحید کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے یہ مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقہ میں مشرکانہ نظام کو مغلوب کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ہمیشہ کے لئے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی مہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:

سنريهم آياتنا فى الآفاق وفى انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق (حم السجدہ ۵۳) پہلے مرحلہ کا مطلب مظاہر فطرت سے سیاسی نظریہ اخذ کرنے کو ختم کرنا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری طرح انجام پا گیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ مظاہر فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علم کی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دور نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک اظہار ہے۔ یہاں مخلوقات کے آئینہ میں آدمی اس کے

خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کر کے خدا کی قدرت اور عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر قدیم مشرکانہ افکار نے دنیا کی چیزوں کو پر اسرار طور پر مقدس بنا رکھا تھا۔ ہر چیز کے بارہ میں کچھ توہماتی عقائد بن گئے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی تحقیق وجستجو میں مانع تھے۔ توحید کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا خدا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارہ میں تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی۔

اس تحقیق اور مطالعہ کے نتیجہ میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو مخفی نظام کارفرما ہے وہ انسان کے سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشین گوئی کامل صورت میں پوری ہو گئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (حم السجدہ ۵۳) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انھوں نے ہمیشہ کے لئے توہماتی دور کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ معلومات ایک مومن کے لئے اضافۂ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا ذہن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ آدمی کو اس درجۂ احسان تک پہنچا دے جس کو حدیث میں تعبد اللہ کانک تراہ (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) کہا گیا ہے۔

دور جدید میں احیاء اسلام

موجودہ زمانہ میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔ اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجہ میں ملحدانہ افکار انسان کے اوپر غالب آگئے ہیں۔ علم وعمل کے ہر شعبہ میں الحادی طرز فکر اس طرح چھا گیا ہے کہ دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں پیدا ہو، وہ ملحدانہ افکار کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ الحاد آج کا غالب دین ہے۔ اور اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کو ممکن بنانے کے لئے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے غلبہ کے وقت اختیار کئے گئے تھے۔ یعنی افراد کی تیاری۔ اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔
پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانہ میں دوبارہ خدا نے اسی طرح بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دور اوّل میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔

موجودہ زمانہ میں اسلامی احیاء کی مہم چلانے کے لئے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے اسلام ایک دریافت (Discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ یہی دریافت کا واقعہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، مردانگی، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لئے درکار ہیں وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔ مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابلہ میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دئے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

قرن اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ ان پر دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دئے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج اگر اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہو نہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔

۲۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے گذر کر ابتدائی اصل تک نہیں پہنچتی۔ یہی معاملہ آج مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان

شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں نہ کہ حقیقۃً قرآن اور سنت رسول سے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لئے فخر کی چیز بنا ہوا ہے نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کو قرآن وسنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسئولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اسلام کو جب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اسی جذبہ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہو گئیں۔ کیوں کہ فخر کا جذبہ نمائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسئولیت کا جذبہ حقیقی اور سنجیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی احیاء کی مہم کو موثر طور پر چلانے کے لئے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن وحدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ سے۔ قرآن وحدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی مہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (Persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور "غرناطہ" میں اپنی اسلامیت کا تشخص دریافت کیا۔ چوں کہ موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لئے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے چھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا اس لئے جب وہ چھن گئیں تو ہم شکایت اور محرومی کا پیکر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آ رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو زیادہ بڑی چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھنی ہوئی محفوظ ہے اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چھوٹی چیز ہم سے چھن گئی ہے اس کے لیے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ انھیں اس عظمت کو چھینتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے

خلاف وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لئے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھنے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیاء کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے۔ مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آ چکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں نہ کہ مادی حریف اور قومی رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر تمام شکایتوں کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے یک طرفہ قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کے لئے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں دوبارہ اسی قسم کا ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران ۱۱۰) کے لئے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آمیز فضا میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادی غیر ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہوگی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لئے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لئے تیار رہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت

کے اعلیٰ معاشی مواقع سے محروم کر کے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعلق باللہ اور فکر آخرت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ ، فلپ ہٹی کے مذکورہ الفاظ میں، دوبارہ ایک قسم کی " نرسری آف ہیروز " بنانے کے ہم معنی ہوگی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابل لحاظ ٹیم تیار نہ ہو جائے ، احیاء اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہوگی ——

ولولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم ولعلهم یرجعون۔ یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کر کے ایک علیحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ وہ اہل عالم کے لئے منذر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم ٹکرا کر اتنا کمزور کر دیا کہ اہل اسلام کے لئے ان کو مغلوب کرنا آسان ہو گیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارہ میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانہ میں توہماتی طرز فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارہ میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلاء رب (کرشمۂ خدا) خدا کہا گیا ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ توہماتی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اوّل کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لئے تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعاتِ فطرت کو خالص علمی انداز میں جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پا کر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا توہماتی پردہ کو ہٹا کر کرشمۂ خدا کا کرشمہ خدا ہونا ثابت کر دیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو " معبود " کے مقام سے ہٹا کر " مخلوق " کے مقام پر رکھ دیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ چاند جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دئے اور وہاں اپنی مشینیں

اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے جو نئے دلائل فراہم کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے معجزات ظاہر کئے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انھیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانہ میں سائنسی معلومات کے بارہ میں پیش آرہا ہے۔ سائنسی تحقیق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ سب خدا کی خدائی کا ثبوت ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انھوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انھوں نے اس بات کا ثبوت بنا دیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک مشینی عمل کے تحت اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ بامعنی اور بامقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بے معنی انبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ بامقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں تنظیم اور مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کارفرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کا رخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بجائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (End) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (Effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادہ کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واقعات کے بے شعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے بامعنی بھی ہو ــــ یہ بے معنی توجیہہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ بامعنی کائنات کو بلا ارادہ کارفرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد ملحد مفکرین نے بہت بڑے پیمانہ پر سائنس کو الحاد کا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتابیں چھپی ہیں جن کے

ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی مفکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سرجیمز جینز کی پراسرار کائنات (The Mysterious Universe) ہے۔ اس کتاب میں لائق مصنف نے نظریہ تعلیل (Principle of Causation) کو خالص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا شینی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت برتر سطح پر دینی عقائد کی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسا دینی مفکر سامنے نہیں آیا جو ان سائنسی معلومات کو دینی صداقتوں کے اثبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو سکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتداءً یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اوّل آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا (عسیٰ ان یبعثك ربّك مقاما محمودا) اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گذر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم واعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ "معلوم نہیں یہ واقعتہً پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں"، اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لئے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔ اس کے حق میں مسلمہ تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس بعد کے مرحلہ تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔ کیوں کہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام

کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے۔ دوسرے انبیاء اپنے زمانہ میں لوگوں کے لئے اس لئے نزاعی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے، بعد کے دور میں وہ دوبارہ نزاعی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے معیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثناء ہے۔ آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصہ میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔

پیغمبر آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاتح رہے۔ آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔ جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر معاصر تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نزاعی مرحلہ سے نکل کر محمودی مرحلہ میں پہنچ گئی۔ آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لئے آپ کے بارہ میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانہ میں دین حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (Advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعی گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلّمہ (Established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (Controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جا سکتی تھی۔

دوسری امتیں اگر نبوت نزاعی کی وارث تھیں تو، ہم نبوت محمودی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کے سامنے شہادت حق کا جو کام انجام دینا ہے اس کے لئے خدا نے آج ہر قسم کے موافق مواقع مکمل طور پر کھول دئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کار شہادت کو انجام نہ دیں۔ یا شہادت دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ رب العلمین کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۳ کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمنار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمنار میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔

دعوت اور اتحاد

مسلمانوں کا اتحاد مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اور اس اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے دعوت دین کے کام کے لئے چن لیا ہے۔ پیغمبر نے جو دین ان تک پہنچایا ہے اسی کو انھیں تمام قوموں تک پہنچانا ہے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ یعنی ایک خدا کے گرد سب کے سب متحد ہو جاؤ (لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ، الحج ۷۸)

دعوت کے حکم کے ذیل میں اتحاد کی تاکید سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت اور اتحاد میں بہت گہرا باہمی تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت سے باہمی اتحاد پیدا ہوتا ہے اور باہمی اتحاد سے مسلمان اس قابل ہوتے ہیں کہ دعوت کے کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

حدیث سے بھی دعوت اور اتحاد کا باہمی تعلق ثابت ہے۔ حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو تم میری طرف سے لوگوں تک پہنچا دو اور آپس میں اختلاف نہ کرو جس طرح حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اختلاف کیا (اخرج الطبرانی عن المسور بن مخرمۃ رضی اللہ عنہ قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ اصحابہ فقال انّ اللہ بعثنی رحمۃ للنّاس کافۃ فادوا عنی ولا تختلفوا کما اختلف الحواریون علی عیسی بن مریم)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات فرمائی تو صحابہ نے کہا اے خدا کے رسول، ہم آپ سے کبھی کسی معاملہ میں اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے (یا رسول اللہ، انّا لا نختلف علیک فی شیٔ ابداً فمُرنا وابعثنا، البدایہ والنہایہ، جلد ۴) صحابہ کو معرفت دین کا جو مرتبہ حاصل تھا اس نے انھیں بتا دیا تھا کہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور اس معاملہ میں انھیں کس قسم کا کردار پیش کرنا چاہئے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت تک باہمی اتحاد و اتفاق رہا جب تک وہ دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول رہے۔ جیسے ہی وہ اس کام سے ہٹے ان کے درمیان ایسا اختلاف اور ٹکراؤ شروع ہوا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے دعوت الی اللہ کو بھی کھو دیا جو ان کا فرض منصبی تھا۔

اور باہمی اتحاد کو بھی جو اس دنیا میں کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے (الانفال ۴۶)

قرن اوّل کی مثال

مشہور قول کے مطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ ھ کو ہوئی۔ اس سے صرف دو ہفتہ پہلے کا واقعہ ہے کہ عین مرض الموت کی حالت میں آپ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کی ایک فوج تیار کی۔ یہ رومیوں (بازنطینیوں) سے مقابلہ کے لئے تھی۔ اس فوج میں آپ نے تمام بڑے بڑے صحابہ کو شامل کیا۔ ان کے اوپر اُسامہ بن زید بن حارثہ کو سردار بنایا اور ان کو شام کی طرف روانہ کیا جہاں اس سے پہلے موتہ کے مقام پر رومیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی تھی۔ ۱۷ سالہ اُسامہ ایک غلام کے لڑکے تھے۔ تاہم وہ اس خاص مہم کی سرداری کے لئے موزوں ترین تھے۔ کیوں کہ اس سے پہلے غزوہ مُوتہ (۸ ھ) میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا اور اس بنا پر بیٹے کے دل میں اپنے باپ کے قاتلوں سے لڑنے کے لئے آگ لگی ہوئی تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت اسامہ بن زید اس مہم پر روانہ ہوگئے۔ وہ مدینہ سے ایک فرسخ دور جرف کے مقام پر ٹھہرے۔ یہاں لوگ آ آکر ان کے ساتھ ملنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جرف وہی مقام ہے جہاں مدینہ کی موجودہ جامعہ اسلامیہ قائم ہے۔

اسامہ بن زید اور ان کا لشکر ابھی جرف ہی میں تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی۔ اس کو سن کر ان لوگوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا اور آپ کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے مدینہ واپس آگئے۔

اب صحابہ کے اتفاق رائے سے ابو بکر صدیق رضے اللہ عنہ پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ کی خلافت کے بعد مسلمانوں کی عام رائے یہ تھی کہ اسامہ کے لشکر کو مدینہ میں روک لیا جائے۔ پیغمبر اسلام کی وفات اور عرب کے اکثر علاقوں میں منافقین کے بڑھتے ہوئے فتنے کی وجہ سے اس وقت ہر طرف غیر یقینی حالت چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ پہلے مدینہ کی نئی اسلامی ریاست کو مضبوط بنایا جائے۔ اس کے بعد باہر کی کسی مہم پر نکلا جائے۔

مگر خلیفہ اول نے عمومی مخالفت کے باوجود اسامہ کے لشکر کی روانگی میں معمولی تاخیر بھی گوارا نہ کی۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں اس گرہ کو نہیں کھولوں گا جس کو اللہ کے رسول نے باندھا۔ خواہ چڑیاں ہم کو اچک لیں اور اطراف کے درندے ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور خواہ کتے امہات المومنین کے پیروں کو گھسیٹیں۔ میں ہر حال میں اسامہ کے لشکر کو روانہ کروں گا (**واللہ لا احل عقدۃ عقدھا**

رسول اللہ۔ ولوان الطیر تخطفتنا والسباع من حول المدینۃ۔ ولوان الکلاب جرت بارجل امھات المومنین لاجھزن جیش اسامۃ)

خلیفہ اوّل نے اس معاملہ کی انتہائی اہمیت کو لوگوں پر واضح کرنے کے لئے مزید یہ کیا کہ جب لشکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا تو آپ مدینہ سے جرف تک اس طرح گئے کہ نوجوان اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور خلیفہ اول ان کو نصیحت اور ہدایت دیتے ہوئے ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اسامہ کے اصرار کے باوجود وہ سواری پر نہیں بیٹھے (فشیع البعثۃ وھوماشٍ علٰی قدمیہ فقال اسامۃ یاخلیفۃ رسول اللہ، واللہ لترکبن اولا نزلن۔ فقال واللہ لاتنزل و واللہ لاارکب۔ وماعلیّ ان اغبر قدمیّ فی سبیل اللہ ساعۃ)

پیغمبر اسلام اور خلیفہ اول کا یہ اقدام نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا۔ یہ مصلحت تھی ـــــــ مسلمانوں کے جذبہ جہاد کے لئے عرب کے باہر میدان عمل فراہم کرنا۔ "جہاد" حقیقۃً خارجی دائرہ میں اسلام کی توسیع واشاعت کے لئے جد وجہد کا عنوان ہے۔ لیکن اگر خارجی نشانہ مسلمانوں سے اوجھل ہو جائے تو وہ داخلی لڑائی میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے غلط طور پر اس کو جہاد کا نام دے دیتے ہیں۔

خارجی نشانہ

پیغمبر کی تحریک کے نتیجہ میں عرب کے لوگ جب اسلام لائے تو ان کے اندر زبردست اسلامی جوش پیدا ہو گیا۔ انھوں نے چاہا کہ جس دین کو انھوں نے سب سے بڑی سچائی پاکر اختیار کیا ہے اس دین کو تمام لوگوں کا دین بنا دیں۔ اس جوش کو اپنے اظہار کے لئے کوئی وسیع میدان درکار تھا۔ اسامہ کے لشکر کی بروقت روانگی کا مقصد مسلمانوں کے لئے یہی میدان کار فراہم کرنا تھا۔ پیغمبر اسلام نے رومیوں کی جارحیت کو فوراً استعمال کیا اور اپنے آخر وقت میں ان کے ساتھ مڈبھیڑ کر کے یہ کیا کہ مسلمانوں کے جوش کو غیر مسلم اقوام میں اسلامی دعوت کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ جو طاقت داخلی لڑائیوں میں ضائع ہوتی وہ خارجی عمل میں استعمال ہونے لگی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو عرب کے مسلمان ایک دوسرے کی اصلاح کے نام پر آپس میں لڑنا شروع کر دیتے۔ جیسا کہ آج کل ہم تمام مسلم ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام اگر عین وقت پر مسلمانوں کے جذبۂ عمل کو خارج کی طرف نہ موڑتے تو اس کے بعد ان کے درمیان جو داخلی لڑائیاں شروع ہوتیں ان کا انجام صرف یہ نکلتا کہ اسلام کی تاریخ جہاں بننا شروع ہوئی تھی وہیں وہ بننے سے پہلے ختم ہو جاتی۔ تاریخ آج جن شاندار اسلامی کرداروں کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے وہ ان کے مرثیہ سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ مقصد میں مشغول ہونا اعلیٰ کردار

کی سب سے بڑی ضمانت ہے، اور دعوت الی اللہ کے محاذ سے ہٹنے کے بعد مسلمان یہی اعلیٰ ترین چیز کھو دیتے ہیں۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں اس عمل کا رخ پہلے رومیوں کی طرف پھیرا گیا تھا۔ جلد ہی بعد فارسیوں (ساسانیوں) کی جارحیت کی بنا پر فارس سے بھی مسلمانوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کے لئے اسلامی عمل کا اتنا وسیع میدان ہاتھ آ گیا جو ایشیا سے لے کر افریقہ اور یورپ تک چلا گیا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں یہی دونوں سلطنتیں روم اور فارس) دنیا کے اکثر آباد حصہ پر چھائی ہوئی تھیں۔

رومیوں اور ایرانیوں کی طرف مسلمانوں کا یہ اقدام حقیقۃً کسی سیاسی مقصد یا ملکی توسیع کے لئے نہ تھا، بلکہ تمام تر اسلامی دعوت کے لئے تھا۔ یہ مسلمان اس ربانی جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی سرحدوں سے نکلے تھے کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کے دائرہ میں لے آئیں (لنخرج عباد اللہ من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ) واقعات ثابت کرتے ہیں کہ روم اور فارس مسلمانوں کے لئے اصلاً دعوت حق کا موضوع تھے۔ مگر ان قوموں کی طرف سے جارحیت کی بنا پر ان کے درمیان جنگ کی نوبت آ گئی۔ ورنہ جن قوموں نے جنگ نہیں کی ان کے درمیان اسلام کسی لڑائی بھڑائی کے بغیر پھیلتا رہا۔ مثلاً حبش، مالدیپ، ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ

قدیم غیر مسلم اقوام تک اسلام کی توسیع و اشاعت کا عمل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا۔ تقریباً ۳۰ سال تک وہ پوری کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اس پوری مدت میں مسلمان متحد اور متفق ہو کر دوسری قوموں میں اسلام کی اشاعت کرتے رہے۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ عظیم مسلم جغرافیہ ہے جس کو آج عرب دنیا کہا جاتا ہے۔

عام الجماعت (اتحاد کا سال)

خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضے اللہ عنہ کے آخری زمانہ میں یہ تسلسل ٹوٹتا ہے۔ مسلمانوں نے "داخلی جہاد" کے جوش میں اپنے عمل کا رخ باہر سے اندر کی طرف موڑ دیا۔ اصلاح سیاست کے نام پر وہ خود اپنے حکمرانوں سے لڑنے لگے۔ یہ باہمی ٹکراؤ یہاں تک بڑھا کہ مسلمانوں میں سے ایک طبقہ نے اپنے خلیفہ کو قتل کر ڈالا۔

تاہم خلیفہ کے قتل پر بھی مسئلہ ختم نہ ہوا۔ اب خون عثمان کے قصاص کے نام پر مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ اس طرح آپس میں ایسی لڑائیاں شروع ہوئیں جو مسلسل دس سال تک نہایت خوں ریز شکل میں جاری رہیں۔ اسلام کی عمومی دعوت کے محاذ سے ہٹنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف اسلام کی توسیع و اشاعت کا کام بالکل رک گیا اور دوسری طرف مسلمانوں کی طاقت خود مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے لگی۔

جو مسلمان اسلام کے مقصد کے لئے باہم جڑے ہوئے تھے وہ خود اسلام کے نام پر مختلف اور منتشر ہو کر رہ گئے۔

تقریباً دس سال کے اختلاف اور انتشار کے بعد مسلمان دوبارہ ۴۱ھ میں متحد ہوئے۔ اس بنا پر اس سال کو اسلامی تاریخ میں عام الجماعت (اتحاد کا سال) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں دوبارہ اتحاد کا یہ واقعہ حسن بن علی رضے اللہ عنہ کے ذریعے پیش آیا جن کی بابت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اللہ ان کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا (ان ابنی ھٰذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین، رواہ البخاری)

حضرت حسن اپنے والد کے بعد اسلام کے پانچویں خلیفہ مقرر ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے باہمی جنگ کا سبب بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لئے یک طرفہ طور پر اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسلمان دو متحارب گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کے سردار حضرت حسن تھے اور دوسرے کے سردار حضرت معاویہ۔ حضرت حسن نے جب خلافت کے حق سے دست بردار ہو کر داخلی محاذ کو بند کیا تو اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کا رخ دوبارہ اسلام کی توسیع و اشاعت کی طرف مڑ گیا۔ اسلام کا بڑھتا ہوا قافلہ جو دس سال سے رکا ہوا تھا، وہ دوبارہ خدا کے دین کی عمومی اشاعت کے میدان میں سرگرم ہو گیا۔ معاویہ بن ابی سفیان رضے اللہ عنہ کی خلافت کے ۲۰ سالوں (۴۰ - ۶۰ھ) میں اسلام کی اشاعت اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی جس کی مثال بعد کی صدیوں میں نہیں ملتی۔ ان کے زمانہ میں اسلام کا قافلہ ایک طرف سمرقند، دوسری طرف افغانستان اور تیسری طرف تیونس تک پہنچ گیا۔ چوتھی طرف مسلمان آبنائے باسفورس کو پار کر کے جزیرہ روڈس پر قابض ہو گئے جو گویا قسطنطنیہ میں داخلہ کا پہلا زینہ تھا۔ اس طرح ان کے عہد خلافت میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر طرف اسلام کی توسیع ہوئی۔ اسلام کا قافلہ خشکی سے گذر کر سمندروں میں سفر کرنے لگا۔

ایک تاریخی سبق

معاویہ رضے اللہ عنہ کی خلافت پر کچھ لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے اندر ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ مگر اس سے قطع نظر، معاویہ رضے اللہ عنہ کے ۲۰ سالہ خلافت کی تاریخ ایک بہت بڑا سبق دیتی ہے۔ وہ سبق یہ ہے مسلمانوں کو اگر کسی طرح باہمی لڑائی سے ہٹایا جا سکے، خواہ یہ سیاسی ادارہ میں ملوکیت کو برداشت

کرنے کی قیمت پر کیوں نہ ہو، تو اسلام کے حق میں اس کا نتیجہ نہایت مفید شکل میں نکلتا ہے۔ باہمی لڑائی کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ افراد کا جوش اسلامی آپس کی تخریب پر صرف ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو باہمی لڑائی کے محاذ سے ہٹا دیا جائے تو ان کا جوش عمل اسلام کی توسیع و اشاعت کے میدان میں اپنا نکاس ڈھونڈ لے گا۔

مسلمانوں کا دو گروہ بن کر آپس میں لڑنا سراسر حرام ہے۔ تاہم جب مسلمانوں کو باہمی لڑائی سے بچایا جاتا ہے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک فعل حرام کے ارتکاب سے بچ جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا ایک مثبت فائدہ بھی اپنے آپ حاصل ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا جوش اسلامی اس کے بعد رکا نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے اظہار کے لئے دوسرا میدان —— اسلام کی توسیع و اشاعت کا میدان —— تلاش کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جو قوت باہمی تخریب میں ضائع ہوتی وہ اسلام کی ترقی اور استحکام میں استعمال ہونے لگتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ مدعا بھی اسی سے اپنے آپ حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے وہ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یعنی مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں اعلیٰ اسلامی صفات کا پیدا ہونا۔

مسلمانوں کا جوش جہاد اگر اسی طرح خارج کی طرف عمل کرتا رہتا جس طرح وہ ابتدائی زمانہ میں عمل کر رہا تھا تو آج دنیا کی تاریخ دوسری ہوتی جس طرح عرب ملکوں کی تاریخ ہمیشہ کے لئے دوسری ہو چکی ہے۔

دعوت کے ذریعہ اتحاد

دعوت الی اللہ یا تبلیغ اسلام ہی امت مسلمہ کا منصبی مشن ہے۔ اس مشن سے مراد اصلاً یہ ہے کہ خدا کے دین کو غیر مسلم اقوام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جو مستقل مشن دیا ہے وہ یہی مشن ہے جس کا دوسرا نام شہادت علی الناس ہے (الحج ۷۸)۔ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ اب مسلمانوں کو دعوت الی اللہ کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے اس سے پہلے رسول آیا کرتے تھے۔

یہ عمل جو امت مسلمہ کا اصل مشن ہے، اسی کی ادائیگی سے خدا کی نصرت ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسی سے امت کے اندر وہ اہم ترین چیز پیدا ہوتی ہے جس کا نام اتحاد و اتفاق ہے۔

دعوت (غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت) ایک ایسا کام ہے جو آدمی کے لئے خارج میں عمل کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اپنے عملی حوصلہ کی تکمیل کے لئے وہ اندر کے بجائے باہر کا میدان کھولتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو اپنے جذبہ جہاد یا جوش اسلامی کے استعمال کے لئے اپنی صفوں سے باہر کی دنیا میں نشانہ مل جاتا ہے۔ لوگ داخلی مقابلہ آرائی سے ہٹ کر خارج میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں لگ جاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اسلام کی تاریخ اس کا زبردست ثبوت فراہم کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۳۰ سال تک مسلمان خارجی میدان میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں مصروف تھے تو ان کی اندرونی صفوں میں مکمل اتحاد قائم رہا۔ حضرت عثمان کے آخری زمانہ میں "داخلی جہاد" کا آغاز ہوا تو اس قدر باہمی لڑائیاں پیش آئیں کہ دس سال تک کے لئے اسلام کی توسیع کا عمل رُک گیا۔ یہ عمل دوبارہ اس وقت شروع ہوا جب حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری کے نتیجہ میں داخلی مقابلہ آرائی ختم ہوئی۔ اب دوبارہ ۲۰ سال تک مسلسل اسلام کی توسیع ہوتی رہی۔ امیر معاویہ کی وفات (۶۰ ھ) کے بعد بنو امیہ اور بنو ہاشم میں "اصلاح سیاست" کے عنوان پر ٹکراؤ شروع ہوا تو دوبارہ اسلام کی توسیع کا کام رک گیا جو پھر کبھی پہلے کی طرح جاری نہ ہو سکا۔ اسلام کی توسیع اور اس کی اشاعت عام کو چھوڑنے کی قیمت مسلمانوں کو یہ دینی پڑ رہی ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ان کی طاقتیں آپس کے ٹکراؤ اور اختلاف میں ضائع ہو رہی ہیں، وہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ یہ داخلی ٹکراؤ اگرچہ بظاہر اسلام کے نام پر ہو رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں اس سے زیادہ غیر اسلامی کام اور کوئی نہیں۔

۲۔ دعوت الی اللہ اصلاً اس اسلامی کام کا عنوان ہے جو غیر مسلموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے (مسلمانوں کے درمیان کام کا اصطلاحی نام اصلاح ہے، الحجرات ۱۰) جب آپ غیر مسلم کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے ہوں تو ایسا نہیں ہوگا کہ آپ اس کے سامنے آمین بالسر یا آمین بالجہر کے مسائل بیان کریں۔ یا ان دوسرے فروعی مسائل کو چھیڑیں جن کے بارہ میں مسلم فرقوں کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہر مسلمان یہ کرے گا کہ وہ مخاطب کے سامنے توحید، رسالت، آخرت اور مساوات انسانی جیسی بنیادی تعلیمات پیش کرے گا۔ گویا اسلام کی عمومی دعوت کا کام ایک ایسا کام ہے جو بالکل فطری طور پر بنیادی تعلیمات دین کو بحث و گفتگو کا موضوع بنا دیتا ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دین کی بنیادی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں۔ وہ سب کی سب متفق علیہ ہیں۔ اس کے برعکس دین کے فروعی (فقہی) احکام میں کافی اختلافات ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب دعوتی اسلام لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے تو لازمی طور پر اسلام کے بنیادی پہلو، بالفاظ دیگر متفق علیہ پہلو زیادہ سے زیادہ زیر بحث آتے ہیں۔ اور اس کے فروعی، دوسرے لفظوں میں اختلافی پہلو پس پردہ چلے جاتے ہیں۔

اس طرح قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ملت جب دعوتی عمل میں مصروف ہو تو اس کے

اندر اتفاق واتحاد کے اسباب پرورش پاتے ہیں۔ اسلام کے اساسی اور اتفاقی امور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اسلام کے فروعی مسائل کو لے کر اٹھیے تو مسلمانوں کے اندر اختلافات جنم لیں گے۔ اس کے برعکس اسلام کے بنیادی مسائل کو لے کر اٹھیے تو لوگوں کے ذہن زیادہ سے زیادہ متفق علیہ امور پر کام کریں گے۔ ملت کے اندر اختلاف کی جڑ کٹے گی اور ہر طرف اتحاد کی فضا وجود میں آئے گی۔ فروعی مسائل اختلاف کا ماحول پیدا کرتے ہیں اور بنیادی مسائل اتفاق کا ماحول۔

اختلاف کے باوجود اتحاد

انسانوں کے درمیان ہمیشہ اختلافات موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ اتحاد جب کبھی وجود میں آتا ہے تو وہ اس طرح وجود میں نہیں آتا کہ لوگوں میں سرے سے کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔

اصحاب رسول کے درمیان زبردست اتحاد پایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی اتحاد کی وجہ سے وہ اس قابل ہوئے کہ دنیا میں عظیم الشان اسلامی انقلاب برپا کر سکیں۔ مگر یہ اتحاد اس طرح وجود میں نہیں آیا کہ ان کے درمیان آپس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے درمیان دینی مسائل اور دنیوی امور دونوں طرح کی چیزوں کے بارے میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے تھے۔ مگر ان تمام ذاتی اختلافات کے باوجود وہ ایک مرکزی نقطہ پر متحد رہے اصحاب رسول نے اختلاف کے باوجود اپنے کو اسلامی مقصد کے گرد متحد کر رکھا تھا، نہ یہ کہ ان کے درمیان سرے سے کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔

"اختلاف کے باوجود متحد ہونا"، بظاہر ایک لفظ ہے۔ مگر یہ سب سے بڑی قربانی ہے جو موجودہ دنیا میں کوئی آدمی پیش کرتا ہے۔ اس قربانی کے لئے وہ فیاضی درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کے فائدہ کی خاطر اپنے نقصان کو برداشت کرلے۔ اس کے لئے وہ بلند ہمتی درکار ہے جب کہ ذاتی شکایت کے باوجود وہ دوسرے کے فضل وکمال کا اعتراف کر سکے۔ اس کے لئے وہ بے نفسی درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا ہوتا ہوا دیکھے، پھر بھی وہ منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ اس کے لئے وہ اعلیٰ ظرفی درکار ہے جب کہ آدمی اپنی رائے کو بطور خود اہم سمجھتے ہوئے دوسرے کی رائے کے مقابلہ میں اس کو واپس لے لے۔ اس کے لئے وہ حوصلہ درکار ہے جب کہ آدمی دوسرے کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر خود پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے

لیے راضی ہوجائے۔

اجتماعی اتحاد فرد کی سب سے بڑی قربانی ہے۔ آدمی کسی چیز کو اس وقت چھوڑتا ہے جب کہ اس کو اس سے بڑی کوئی چیز مل جائے۔ دعوت الی اللہ کا مشن یہی سب سے بڑی چیز ہے۔ دعوت وشہادت گویا موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔ آخرت میں سب سے بڑا انعام داعیان حق کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا کوئی کام اس دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت میں مصروف ہونے والے لوگ اس عظیم قربانی کے لئے تیار ہوجاتے ہیں جو کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔

دعوت الی اللہ کا مشن کسی انسان کے لئے سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کے مقابلہ میں تمام چیزیں چھوٹی ہیں۔ ملّت کے موجودہ اختلافات اسی لئے ہیں کہ ملت کے افراد کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ اگر ان کے سامنے بڑا مقصد آجائے تو وہ خود بخود چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھوڑنے پر راضی ہوجائیں گے۔ اور بلاشبہ بڑے مقصد کی خاطر چھوٹی چیزوں کو چھوڑنے کے نتیجہ ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔

نوٹ : یہ مقالہ (عربی زبان میں) الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منوّرہ میں ۲ مارچ ۱۹۸۴ کو پڑھ کر سنایا گیا۔

کائنات کی گواہی

سورہ انعام (رکوع ۴) میں منکرین کے اس مطالبہ کا ذکر ہے کہ وہ رسول سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے اس وعدے میں سچے ہو کہ جو پیغام تم لائے ہو وہ خدا کی طرف سے ہے تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ فرمایا کہ ایمان کا مدار معجز نما واقعات پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی کی آنکھ کھلی ہوئی ہو اور وہ نشانیوں سے سبق لینا جانتا ہو۔ جس میں یہ صلاحیت زندہ ہو، اس کو نظر آئے گا کہ یہاں وہ "معجزہ" پہلے سے نہایت وسیع پیمانہ پر موجود ہے جس کا وہ مطالبہ کر رہا ہے۔ آخر اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ساری کائنات اپنے تمام اجزا سمیت اس پیغام کی سچائی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی طرف خدا کا رسول بلا رہا ہے۔ اور اگر آدمی نے اپنے آپ کو اندھا بنا رکھا ہو، وہ واقعات سے سبق لینے کی کوشش نہ کرتا ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی کارآمد نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں ان دیگر مخلوقات (چڑیوں اور جانوروں) کی مثال دی گئی ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا پائی جاتی ہیں۔ دوسری جگہ زمین و آسمان کو بھی اس مثال میں شامل کیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۴۴) فرمایا کہ اگر تم غور کرو تو تمہارے لیے کافی سامان عبرت و نصیحت کا ان کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ یہ سب بھی تمہاری طرح مخلوقات ہیں۔ ان کو بھی اپنی زندگی میں ایک ڈھنگ اختیار کرنا ہے جس طرح تم کو اختیار کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

مگر تمہارے مقابلہ میں، عالم موجودات کا بے حد بڑا حصہ ہونے کے باوجود، ان کا معاملہ مکمل طور پر تم سے مختلف ہے۔ وہ ایک ہی مقررہ نقشہ پر کروروں برس سے چل رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے مقرر نقشہ سے ادنیٰ انحراف نہیں کرتا۔ یہ صرف انسان ہے جو ایک مقرر نقشہ کو قبول نہیں کرتا۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنی من مانی راہوں پر دوڑتا رہے۔

رسول کا مطالبہ تم سے کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و مالک ہے۔ تمہارے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم خودسری اور خود رائی کو چھوڑ دو اور اپنے خالق و مالک کے تابع ہو جاؤ۔ غور کرو تو اس دعوت کے حق ہونے پر تمام زمین و آسمان اور تمام حیوانات گواہی دے رہے ہیں (نور ۴۱) کیوں کہ جس دنیا میں تم ہو جب اس کا وسیع تر حصہ خودسری کے بجائے پابندی کا طریقہ اختیار کیے

ہوئے ہے تو تم اس کا بے حد مختصر حصہ ہو کر اس کے خلاف رویّہ اپنانے میں حق بجانب کیسے ہو سکتے ہو۔

عظیم الشان کائنات کا ہر جزء، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ سب اپنے ایک ہی متعین راستہ پر اتنی صحت کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی عزیز و علیم نے ان کو بزور اس کا پابند کر رکھا ہے (یٰس ۳۸)۔ اتنی بڑی کائنات میں انسان کا الگ راستہ اختیار کرنا بتا رہا ہے کہ انحراف انسان کی طرف ہے نہ کہ بقیہ کائنات کی طرف (آل عمران ۸۳)

ساری کائنات اپنے لاتعداد اجزاء کے ساتھ انتہائی متوافق طور پر حرکت کرتی ہے۔ ان میں کبھی باہم ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان ہے جو آپس میں ٹکراؤ کرتا ہے۔ تمام کائنات اپنی ناقابل قیاس سرگرمیوں کے ساتھ ہمیشہ نفع بخش انجام کی طرف جاتی ہے۔ مگر انسان ایسی کارروائیاں کرتا ہے جو تباہی اور بربادی پیدا کرنے والی ہوں۔

دو قسم کے پانی اپنی اپنی حد مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کی حد کو نہیں توڑتا، حتیٰ کہ سانڈوں کا گروہ بھی اپنے اپنے حدود کو متعین کر لیتا ہے۔ ہر سانڈ اپنی حد کے اندر کھاتا پیتا ہے، دوسرے سانڈ کی حد میں نہیں گھستا۔ مگر انسان کسی حد بندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں حد درجہ نظم اور تقسیم کار کے ساتھ اپنی تعمیری سرگرمیاں انجام دیتی ہیں۔ مگر انسان نظم و ضبط کو توڑتا ہے۔ چیونٹیاں اور چڑیاں رزق کی فراہمی میں اپنی محنت پر بھروسہ کرتی ہیں۔ وہ کسی سے چھین جھپٹ نہیں کرتیں۔ مگر انسان دوسرے انسان کا استحصال کرتا ہے۔

کوئی شیر یا بھیڑیا اپنی نوع کے جانور کو نہیں پھاڑتا۔ مگر انسان انسان کا خون بہاتا ہے۔ کوئی جانور حتیٰ کہ سانپ بچھو بھی بلاوجہ کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ وہ حملہ کرتے ہیں تو صرف اپنے بچاؤ کے لیے۔ مگر انسان دوسرے انسانوں کے اوپر یک طرفہ جارحانہ کارروائیاں کرتا ہے۔ تمام جانور بقدرِ ضرورت کھاتے ہیں۔ بقدرِ ضرورت جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اور بقدر ضرورت گھر بناتے ہیں۔ مگر انسان ہر چیز میں اسراف اور بے راہ روی اور غیر ضروری تکلّفات کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

تمام جانور صرف اپنے دائرہ کار میں اپنے کو مصروف رکھتے ہیں۔ مگر انسان اپنے دائرہ عمل کو چھوڑ کر

دوسرے کے دائرہ میں مداخلت کرتا ہے۔ ایک چرواہہ کی پچاس بکریاں جنگل میں چرتے ہوئے ہزاروں بھیڑ بکریوں سے مل جائیں اور اس کے بعد ان کا چرواہہ ایک مقام پر کھڑے ہوکر آواز دے تو اس کی تمام بکریاں نکل نکل کر اس کے پاس آجاتی ہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تو وہ سننے اور سمجھنے کے بعد بھی اس پکار کی طرف نہیں دوڑتا۔

انسان ساری کائنات کا اس سے بھی کہیں زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا پوری زمین کے مقابلہ میں سرسوں کا ایک دانہ۔ پھر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ کیسے درست ہوسکتا ہے جو وسیع تر کائنات کا راستہ ہے۔ اگر اتنی عظیم الشان دلیل کے باوجود آدمی اپنے لیے الگ راستہ کا انتخاب کرتا ہے تو موجودہ کائنات میں وہ اپنے کو بے استحقاق ثابت کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا انجام صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اس کو کائنات میں بے جگہ کر دیا جائے۔ کائنات کی تمام چیزیں اس کے ساتھ مساعدت کرنے سے انکار کر دیں۔ تمام کائناتی نعمتوں کو اس سے چھین کر اس کو ابدی محرومی میں ڈال دیا جائے۔

آدمی جس کائنات کا ہم سفر بننے کے لیے تیار نہیں، اس کو کیا حق ہے کہ اس کائنات کی چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ انجام ہونا چاہیے کہ کائنات کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ صرف ان انسانوں کو دے دیا جائے جو اس کے ہم سفر بنے، جنہوں نے اپنے خالق و مالک کی تابعداری اسی طرح کی جس طرح ساری کائنات کر رہی تھی۔ اس کے سوا وہ انسان جنہوں نے بغاوت اور خود رائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کو نہ اس دنیا کی روشنی میں حصہ دار بننے کا حق ہے اور نہ اس کی ہوا اور پانی میں۔ وہ اس دنیا میں نہ اپنے لیے مکان بنانے کا حق رکھتے اور نہ کھانے اور آرام کرنے کا۔

انصاف کا تقاضہ ہے کہ کائنات اپنے جنتی امکانات کے ساتھ صرف پہلے گروہ کے حصہ میں آئے اور دوسرے گروہ کو یہاں کی تمام بہترین چیزوں سے محروم کر کے چھوڑ دیا جائے۔

اسلام کا اخلاقی تصور

اخلاقیات کا موضوع مذہب اور فلسفہ دونوں کا مشترک موضوع ہے۔ مگر دونوں کے طریق بحث میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مذہب اخلاقی اصولوں کو بطور خدائی حکم کے پیش کرتا ہے۔ جب کہ فلسفہ "کیا" کے ساتھ "کیوں" کے سوال کی تحقیق بھی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک چیز اخلاقی طور پر درست ہے تو وہ کیوں درست ہے۔ اسی طرح ایک چیز اخلاقی طور پر نادرست ہے تو کیوں نادرست ہے۔

اس فرق نے دونوں کے درمیان ایک عظیم فرق پیدا کر دیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ مذہب میں اخلاق ایک معلوم اور متعین چیز کا نام ہے جس میں بنیادی طور پر کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اس کا خدا کا حکم ہونا اس کو ایک قطعی صورت دے دیتا ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ میں چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفیوں سے لے کر بیسویں صدی کے جدید مغربی فلسفیوں تک لامتناہی بحثیں جاری ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ انسانی عمل کے لیے اخلاقی معیار (Criteria of ethics) کیا ہونا چاہیے۔ ہر فلسفی نے اپنا ایک مدرسۂ فکر بنا دیا مگر وہ دنیا کو کوئی مسلّمہ اصول اخلاق نہ دے سکا۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی محدودیتیں (Limitations) اس میں حائل ہیں کہ انسان "کیوں" کے سوال کو حل کر سکے۔ چنانچہ ہم نے فلسفیانہ بحثوں کے بجائے عملی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ اس مقالہ میں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کا جو اصولی اور بنیادی تصور دیا گیا ہے اس کو سادہ انداز میں بیان کریں۔

کائنات کی سطح پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے۔ تم خدا کی تخلیق میں کوئی خلل نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ تم دوبارہ نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ آخر کار تمہاری نگاہ حقیر اور عاجز ہو کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔ (الملک ۴)

خدا نے ایک عظیم کائنات پیدا کی۔ اس کائنات میں ہر آن بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر تمام سرگرمیاں نہایت منظم طور پر ہو رہی ہیں۔ کہیں کوئی بے قاعدگی نہیں۔ کسی کا عمل یہاں اعلیٰ معیار سے کم نہیں۔

اخلاق خداوندی

انسان کو خدا نے اس نظام کی پابندی سے بظاہر آزاد رکھا ہے۔ تاہم یہ آزادی صرف امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہے۔ ورنہ انسان سے بھی عین وہی روش مطلوب ہے جو بقیہ کائنات میں خدا نے قائم کر رکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ بقیہ کائنات میں یہ روش خدا کے براہ راست کنٹرول کے تحت قائم ہے اور انسان کی زندگی میں اس کو خود انسان کے اپنے ارادے کے تحت قائم ہونا ہے۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے اخلاق کو اپنا اخلاق بناؤ (تخلقوا باخلاق اللہ)

اسلامی اخلاق کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ اخلاق ایک کائناتی حقیقت ہے۔ جو اخلاق (Standards of conduct) بقیہ کائنات کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی اخلاق انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کے لیے بقیہ کائنات ایک اخلاقی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک اچھے انسان کے لیے بھی وہی بات صحیح ہے جو میگول ڈی سروینٹیز (Miguel de Cervantes) نے ایک اچھے مصوّر کے بارہ میں کہی ہے:

Good painters imitate nature, bad ones vomit it.

اچھے مصوّر فطرت کی نقل کرتے ہیں، برے مصوّر اس کو اگل دیتے ہیں۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے اس کو خدا نے ایک قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔ وہ لازمی طور پر اس کے مطابق عمل کرتی ہے۔ اس کائناتی قانون کو سائنس کی زبان میں قانون فطرت کہا جاتا

ہے ۔ قرآن میں اسی بات کو اس طرح کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان خدا کے امر کے تحت ہیں (السجدہ ۵) اور پھر یہی مطالبہ انسان سے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے امر کا ماتحت بن کر رہے (آل عمران ۱۵۴) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا ایک ہی قانون ہے جس کی پیروی کائنات اور انسان دونوں سے مطلوب ہے ۔ بقیہ کائنات بجبر اس قانون کو اختیار کیے ہوئے ہے ۔ اور انسان کو خود اپنے ارادہ کے تحت اس قانون کو اختیار کرنا ہے ۔

اسلامی اخلاق کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں ملتا ہے :

" کیا لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں ۔ حالانکہ اسی کے تابع ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا ناخوشی سے ۔ اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے (آل عمران ۸۳)

قرآن کی اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بقیہ کائنات کا نظام جن اصولوں پر عملاً قائم کر رکھا ہے اسی کے مطابق وہ انسانی زندگی کے نظام کو بھی دیکھنا چاہتا ہے ۔ انسانی معاشرہ کو بھی انہیں ضابطوں میں ڈھل جانا چاہیے جس کا نمونہ کائناتی سطح پر ہر آن دکھایا جا رہا ہے ۔

اتحاد و تنظیم

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی ایک مقررہ سبیل ہے (الانعام ۱۵۴) تم اسی سبیل خداوندی پر چلو ۔ یہی لفظ قرآن میں شہد کی مکھی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ۔ کہا گیا ہے کہ خدا نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ تم سبیل رب پر چلو (النحل ۶۹) اس سے معلوم ہوا کہ شہد کی مکھی جس طرح کام کرتی ہے وہ خدا کی تسلیم شدہ سبیل ہے ۔ اسی سبیل کی نقل انسان کو بھی کرنا ہے ۔

شہد کی مکھی کا نظام اجتماعی تنظیم کی آئیڈیل مثال ہے ۔ وہ اپنا پورا عمل اعلیٰ درجہ کی متحدہ کارروائی کے ساتھ انجام دیتی ہے ۔ قرآن کے مطابق یہ تنظیم اور متحدہ عمل خدا کا منظور شدہ عمل ہے ۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سماجی زندگی میں اسی کو اپنے تمدنی احوال کے مطابق اختیار کرے ۔ شہد کی تیاری میں لاکھوں مکھیاں شامل رہتی ہیں مگر وہ نہایت درجہ موافقت کے ساتھ سارا کام انجام دیتی ہیں ۔ انسان کو اپنی زندگی میں بھی موافقت کا یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے ۔

دخل اندازی نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ سورج کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے لیے یہ ہے کہ وہ دن سے پہلے آجائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار (Orbit) میں چل رہے ہیں (یٰس ۴۰)

اس آیت میں خدا کے ایک قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس نے سیاروں اور ستاروں کی دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ ہر ستارہ یا سیارہ اپنے اپنے مدار میں حرکت کرے۔ وہ کسی دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل نہ ہو۔ یہ گویا خدا کے پسندیدہ سماجی اصول کی ایک مادی تمثیل ہے۔ خدا ستاروں اور سیاروں کے ذریعہ اس قانون کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کو وہ انسان کی زندگی میں شعوری طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں عمل کرے، وہ کبھی دوسرے شخص کے دائرہ میں داخل نہ ہو۔

قرآن کا یہ اصول ایک مغربی ملک کے قصہ میں بہت خوبصورتی کے ساتھ متمثل ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس ملک کو سیاسی آزادی حاصل ہوئی تو ایک شخص خوشی کے ساتھ سڑک پر نکلا۔ وہ اپنا دونوں ہاتھ زور زور سے ہلاتا ہوا سڑک پر چل رہا تھا۔ اتنے میں اس کا ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر نے غصہ ہو کر کہا کہ تم نے میری ناک پر کیوں مارا۔ آدمی نے جواب دیا کہ آج میرا ملک آزاد ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ راہ گیر نے نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا کہ تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

اس دنیا میں ہر آدمی عمل کے لیے آزاد ہے۔ مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے محدود دائرہ میں عمل کرے۔ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل ڈالے بغیر اپنی آزادی کا استعمال کرے۔ یہ خدائی اخلاقیات کی ایک دفعہ ہے۔ قرآن میں لفظی طور پر اس کا حکم دیا گیا ہے اور آسمان کے ستاروں اور سیاروں کی گردش کو اپنے اپنے مدار کا پابند بنا کر اس اخلاقی اصول کا مظاہرہ (Demonstration) کیا جا رہا ہے۔

تسلیم و اعتراف

قرآن کی ایک آیت اس طرح ہے ـــــ پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔ تو وہ پتھر کی مانند سخت ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ وہ پھٹ جاتے ہیں پھر ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ (البقرہ ۷۴)

یہ آیت تمثیلی زبان (Symbolic language) میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کے بعض اوصاف تمثیل کے روپ میں انسان کے لیے اخلاق کا سبق ہیں۔ پہاڑوں میں پتھروں کے درمیان سے چشمے پھوٹتے ہیں اور ان سے دریا بہہ نکلتے ہیں۔ یہ اس انسانی اخلاق کی تمثیل ہے کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ جب کوئی سچائی اس کے سامنے آئے تو اس کو قبول کرنے کے لیے اس کا سینہ کھل جائے۔ کوئی انسانیت کا موقع آئے تو اس کا سینہ اس کو محسوس کر کے تڑپ اٹھے۔ جس طرح پہاڑ میں پتھروں کے درمیان پانی کا چشمہ اُبل پڑتا ہے اسی طرح انسان کے دل سے حق کے اعتراف کا چشمہ اُبل پڑنا چاہیے۔

اسی طرح پتھروں کا پہاڑ سے گرنا (Landslide) اس بات کی تمثیل ہے کہ انسان کے سامنے جب خدا کا حکم آئے تو اس کے سامنے اس کو سر تسلیم خم (Surrender) کر دینا چاہیے۔ اس کو سرکشی کے بجائے اعتراف کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ جس طرح پتھر فطرت کے قانون کے آگے گر پڑتے ہیں اسی طرح انسان کو خدا کے قانون کے آگے ہمہ تن جھک جانا چاہیے۔

نرم گفتاری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چڑیاں خدا کی تسبیح پڑھتی ہیں (نور ۴۱) دوسری طرف بتایا گیا ہے کہ گدھے کی آواز سب سے بری آواز ہوتی ہے، اس لیے جب تم بات کرو تو گدھے کی طرح مت چیخو بلکہ آہستہ آواز سے بولو۔ (لقمان ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کو وہ آواز پسند ہے جس میں چڑیوں کے چہچہے کی سی مٹھاس ہو خدا کو وہ آواز پسند نہیں جس میں آدمی گدھے کی طرح زور زور سے بولنے لگے اور سننے والے کے لیے

سمع خراشی کا باعث ہو ۔

انسان کے جسم میں زبان انتہائی قیمتی عضو ہے ۔ اسی زبان کے ذریعہ آدمی اپنے خیال کو دوسرے کے سامنے ظاہر کرتا ہے ۔ اسی کے ذریعہ دو آدمی باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں ۔ تاہم زبان کو استعمال کرنے کی دو مختلف صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ آدمی محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے بولے ۔ وہ جب بولے تو اس لیے بولے کہ وہ دوسروں تک وہ بات پہونچا دینا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین بات ہے ۔ اس کی زبان ہمیشہ بھلائی کی زبان ہو ۔ اسی کے ساتھ اس کا انداز کلام سنجیدہ اور معقول ہو ۔ وہ جو بات کہے شرافت اور متانت کے ساتھ کہے ۔

اس کے برعکس زبان کے استعمال کی دوسری صورت وہ ہے جس کی ایک مثال گدھے کی صورت میں پائی جاتی ہے یعنی منہ سے ایسی آواز نکالنا جو سننے والوں کو گراں گزرے ۔ قرآن کے مطابق آدمی کے اوپر لازم ہے کہ وہ اپنی زبان کو بے معنیٰ شور و غل سے بچائے ۔ وہ طنز اور بدگوئی سے پوری طرح بچے ۔ وہ اپنی زبان کو ایسے انداز سے استعمال نہ کرے جو سننے والوں کو ناگوار ہو ۔ انسان کے بول کو چڑیوں کے چہچہے کی مانند ہونا چاہیے نہ کہ گدھے کی چیخ کی مانند ۔

عفو و درگذر

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے حضرت یوسف کے ساتھ جو برا سلوک کیا وہ قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا ۔ ان کو برادران یوسف سے شدید شکایت پیدا ہوئی ۔ مگر اس شکایت کا غبار انہوں نے برادران یوسف پر نہیں نکالا بلکہ فرمایا کہ میں اپنے رنج اور غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں (یوسف ۸۶) حضرت یعقوب کو غصہ انسان کی طرف سے پیدا ہوا تھا مگر اس کو انہوں نے خدا کی طرف موڑ دیا ۔

یہ تحویل (Diversion) عین وہی چیز ہے جو مادی دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ قائم ہے ۔ بارش کے موسم میں جو پانی برستا ہے وہ اکثر بہت زیادہ ہوتا ہے ۔ اگر اس کی ساری مقدار کھیتوں اور آبادیوں میں رہ جائے تو زبردست نقصان ہو ۔ ایسے مواقع پر قدرت یہ کرتی ہے کہ پانی کی ضروری مقدار کو کھیتوں اور آبادیوں میں چھوڑ دیتی ہے اور اس کے بعد پانی کی تمام فاضل مقدار کو نالوں اور ندیوں کی طرف محول (Divert) کر دیتی ہے ۔

قدرت کے اسی اصول کو انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کرنا ہے۔ وہ یہ کہ جذبات کی تمام مضر مقدار کو خدا کی طرف موڑ دیا جائے۔

مختلف انسان جب مل کر رہتے ہیں تو ان کے درمیان بار بار شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک کے اندر دوسرے کے خلاف تلخیاں ابھرتی ہیں۔ یہ شکایتیں اور تلخیاں جس کے خلاف پیدا ہوئی ہیں اگر وہ اسی کے خلاف نکلنے لگیں تو سارا سماج لڑائی جھگڑے کا میدان بن جائے ان حالات میں انسان کو وہی کرنا ہے جو نیچر کرتی ہے۔ یعنی تمام بڑھے ہوئے جذبات کو خدا کے خانہ میں ڈال دینا۔ ایسے تمام معاملات کو خدا کے حوالے کرکے اپنی مثبت تعمیر میں لگ جانا۔ نیچر ایسے عمل سے یہ سبق دیتی ہے کہ ہر آدمی کے پاس ایک تحویلی حوض (Diversion pool) ہونا چاہیے جس میں وہ دوسروں کے خلاف پیدا ہونے والے منفی جذبات کو منتقل کر دیا کرے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو اعتدال کی حالت میں باقی رکھے۔

برائی کے بدلے بھلائی

قرآن میں خدا کے محبوب بندوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ ۳۷) پیغمبر اسلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ جو تم سے برا سلوک کرے تم اس سے اچھا سلوک کرو۔ بالفاظ دیگر، آدمی کو دوسروں سے برائی ملے تب بھی وہ دوسروں کو بھلائی لوٹائے۔ اس کو اشتعال دلایا جائے تب بھی وہ غیر مشتعل رہے۔

یہ اعلیٰ اخلاق عین وہی ہے جس کا تمثیلی نمونہ خدا نے درخت کی صورت میں مادی دنیا کے اندر قائم کر رکھا ہے۔ انسان اور درخت دونوں ایک ہی دنیا میں ایک دوسرے کے آس پاس رہتے ہیں۔ انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جب سانس لیتا ہے تو وہ فضا سے آکسیجن لے کر اپنے اندر داخل کرتا ہے اور اپنے اندر سے کاربن نکال کر باہر کی طرف خارج کرتا ہے۔

اگر درخت بھی یہی کرے تو ہماری دنیا مضر گیس سے بھر جائے اور رہائش کے ناقابل ہو جائے۔ مگر درخت انسان کے بالکل برعکس معاملہ کرتا ہے۔ درخت باہر کی کاربن لے لیتا ہے اور اپنے اندر سے آکسیجن نکال کر فضا میں شامل کرتا ہے جو انسان اور حیوانات کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

قرآن جس اخلاق کا مطالبہ انسان سے کرتا ہے اس کا ایک ماڈل اس نے درخت کی دنیا میں عملاً قائم کر رکھا ہے ۔ یہ اخلاق جو درخت کی دنیا میں مادی سطح پر قائم ہے ، اسی کو انسان اپنی زندگی میں شعوری سطح پر اختیار کرتا ہے ۔ جو اخلاقی معیار خدا نے بقیہ دنیا میں براہِ راست اپنے زور پر قائم کر رکھا ہے اسی اخلاقی معیار کو انسانی دنیا میں خود انسان کو اپنے ارادہ سے قائم کرنا ہے ۔ تاکہ حضرت مسیح کے الفاظ میں " خدا کی مرضی جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو "

وہ اخلاق یہ ہے کہ دوسرے شخص سے اگر آپ کو نفرت ملے تب بھی آپ اس کو محبت لوٹائیں ۔ دوسرے سے آپ کو تکلیف پہونچے تو آپ اس کو اپنی طرف سے آرام پہونچانے کی کوشش کریں ۔ لوگ آپ کو غصہ دلائیں تو آپ انہیں معاف کر دیں ۔ لوگ منفی رویہ کا مظاہرہ کریں تب بھی آپ مثبت رویہ سے ان کا جواب دیں ۔ آپ کا اخلاق یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کاربن دینے والے کو کاربن دیں ۔ بلکہ آپ کا اخلاق یہ ہونا چاہیے کہ جو شخص آپ کو کاربن دے اس کو بھی آپ کی طرف سے آکسیجن ملے ۔

خلاصہ

حقیقت یہ ہے کہ عمل کا جو معیار وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے ، وہی معیار انسان کو اپنی ذاتی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے ۔ جو واقعہ خدا نے بقیہ دنیا میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے ۔ اسی واقعہ کو انسانی دنیا میں انسان کی سطح پر قائم کرنا ہے ۔

کائناتی سطح پر جو چیز لوہا کی شکل میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے ۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھریلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے ۔ کائناتی سطح پر جو چیز قابل پیشین گوئی کردار کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کی صورت میں مطلوب ہے ۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر اچھے سلوک اور خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے ۔

درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو"، کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس طرح مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی نوعیت کی کارروائیوں سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں Recycle اور Decompose کرنے کا اصول کارفرما ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لیے گیس میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں ــــ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کی خرچ کی ہوئی دولت دوبارہ انسان کے لیے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے پھل کا تحفہ دے۔

کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار کام ہو رہے ہیں۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ یہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے۔ بغیر اس کے کہ دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔ کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔ کوئی شخص دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

اسلامی اخلاق حقیقۃً کائناتی اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی سطح پر یہ اخلاقی معیار شعور کے بغیر قائم ہے۔ اور انسان کی سطح پر یہ اخلاقی معیار شعور کے تحت خود اپنے ارادے سے قائم ہوتا ہے۔

فکری انقلاب

المعہد العلی للفکر الاسلامی کا بین اقوامی سیمنار (کوالالمپور، جولائی ۱۹۸۴) مسلم نوجوانوں میں ایک نئے فکری دور کی علامت ہے۔ معہد کے فکر کا خلاصہ اس کے تعارفی پمفلٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کی ناکامی کا سبب خود اس کے اندر ہے نہ کہ اس کے باہر۔ وہ سبب ہے ــــــ ضروری بنیاد تیار کئے بغیر عملی اقدامات کرنا۔ معہد کے نزدیک پہلی ضروری چیز وہ ہے جس کو اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of knowledge) کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ امت کے موجودہ بحران کو حل کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ علم کو اسلامی بنایا جائے:

> The first step toward a genuine solution of the present crisis of the Ummah is the Islamization of knowledge.

تقریباً ۱۲ سال پہلے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ عربی زبان میں اگست ۱۹۷۲ میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا:

لابد من الثورة الفكرية قبل الثورة التشريعية

اس مقالہ میں تفصیل سے یہ دکھایا گیا تھا کہ سیاسی یا قانونی انقلاب سے پہلے فکری انقلاب ضروری ہے۔ امت کے عملی مسائل صرف اس وقت حل ہوں گے جب کہ ہم فکری انقلاب کے ذریعہ اس کے موافق فضا بنا چکے ہوں۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن کی رو سے ہمارا اہم ترین اجتماعی فریضہ قرار پاتی ہے۔ قرآن میں دو مقام پر (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۳۹) یہ حکم دیا گیا ہے کہ ــــــ وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله:

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔

جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے، اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک جارح ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس وقت اسلام تھوڑا تھا۔ چنانچہ جب کوئی شخص دین توحید کو اختیار کرتا تو اہل شرک اسے ستاتے۔ کسی کو وہ قتل کر دیتے۔ کسی کو زنجیروں میں باندھتے اور کسی کو عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی اور یہ صورت حال باقی نہ رہی کہ عقیدہ توحید کی بنا پر کسی کو ستایا جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں فتنہ سے وہی چیز مراد ہے جس کو ایذا رسانی (Persecution) کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔ قدیم زمانہ میں شرک کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ اہل شرک ہزاروں سال تک یہ کرتے رہے کہ وہ توحید کا عقیدہ رکھنے والوں کو ستاتے (وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید)

پیغمبر آخرالزماں کا مشن یہ تھا جس کو آپ نے اپنی زندگی میں مکمل فرمایا کہ آپ اس مخالفانہ صورت حال کو ختم کر دیں۔ وہ شرک کے عمومی غلبہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیں۔ تاکہ خدا کے بندوں کے لئے توحید کا عقیدہ اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بن رہی ہے وہ رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارہ میں فرمایا: انا احمد وانا الماحی الذی یمحواللہ بی الکفر (الحدیث، ۴، صفحہ ۳۲۳)

موجودہ زمانہ میں شرک کی جارحانہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ مگر غور کیجئے تو اصل صورت حال دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔ آج دوبارہ انسان کے لئے دین توحید اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر آج دین سے روکنے والا عنصر اپنا کام فکری طاقت کے زور پر کر رہا ہے نہ کہ شمشیری طاقت کے زور پر۔

آج کا فتنہ جدید ملحدانہ افکار کا فتنہ ہے۔ جو کام قدیم زمانہ میں شرک کرتا تھا وہ آج ملحدانہ افکار انجام دے رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں ایسے افکار غالب آ گئے ہیں جو خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ جو وحی و الہام کو فرضی بتاتے ہیں، جو آخرت کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ افکار دین توحید کو اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔ آج کا فتنہ یہ ہے کہ خود سوچنے کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان یا تو منکر بن گیا ہے یا وہ کم از کم متشکک ہے۔

یہ ایک قسم کا فکری حملہ (Intellectual invasion) ہے۔ ہم کو اس حملہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب ہمیں دوبارہ قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ پر عمل کرنا ہے۔ مگر یہ عمل شمشیر کے ذریعہ نہیں ہوگا، بلکہ افکار کی طاقت کے ذریعہ ہوگا۔ ملحدانہ افکار کا جواب ہمیں توحیدی افکار سے دینا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ علمی استدلال سے جدید ملحدانہ افکار کو بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ نظریات اپنا غلبہ کھو نہ دیں اور توحید کا فکر وقت کا غالب فکر نہ بن جائے۔

غلبہ اور مغلوبیت کا یہ واقعہ اولاً فکری میدان میں ہوگا۔ یہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہوگا جیسا کہ ہم موجودہ زمانہ میں مغربی افکار کی مثال میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم

نے روایتی علوم پر غلبہ پایا ہے۔ شہنشاہی نظریہ کے اوپر جمہوری نظریہ فائق ثابت ہوا ہے۔ تخلیقی طرز فکر پر ارتقائی طرز فکر کو بالاتری حاصل ہے۔ اجتماعی معیشت کے نظریہ کے مقابلہ میں انفرادی معیشت کا نظریہ دفاعی پوزیشن میں چلا گیا ہے۔ یہ سب کے سب فکری غلبہ کے واقعات ہیں۔ اسی نوعیت کا غلبہ ملحدانہ فکر پر موحدانہ فکر کے لئے مطلوب ہے۔ یہی غلبہ ملت کی اگلی تمام کامیابیوں کی تمہید ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں ملحدانہ افکار کا غلبہ ان کی کسی جوہری اہمیت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام تر صرف مغالطہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو نئے سائنسی حقائق دریافت ہوئے وہ حقیقۃً قدرت خداوندی کے بھیدوں کا اظہار تھے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دین توحید کے حق میں فطرت کے دلائل تھے مگر مسلمان مختلف اسباب سے جدید سائنسی علوم میں پیچھے ہوگئے۔ وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ ان علوم کو صحیح رخ دے سکیں۔ اور ان کو دین کی تائید میں استعمال کریں۔ ملحد علماء نے اس خلا سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے جدید معلومات کو غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے حق میں استعمال کیا۔ جن واقعات سے دین توحید کا اثبات نکل رہا تھا، ان کو دین الحاد کی دلیل بنا دیا۔

اس کی ایک واضح مثال ارتقاء کا نظریہ ہے، جس نے موجودہ زمانہ میں ملحدانہ فکر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔

زمینی طبقات کے مطالعہ کے دوران انسان کے علم میں یہ بات آئی کہ قدیم زمانہ کے حیوانات کے ڈھانچے مخصوص کیمیائی عمل کے نتیجہ میں پتھر کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ زمین کی کھدائی سے اس قسم کے بہت سے متحجر نمونے جمع کئے گئے۔ ان پر ریڈیو ایکٹیو ڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کیا گیا تو تقریباً صحت کے ساتھ ان کی تاریخیں معلوم ہوگئیں۔ یہ تحقیقات سو سال سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ انسان اس پوزیشن میں ہوگیا کہ مختلف انواع حیات کے درمیان تاریخ کے اعتبار سے ترتیب قائم کر سکے۔

اس تاریخی ترتیب سے معلوم ہوا کہ وہ تمام مختلف انواع حیات جو آج زمین پر بظاہر بیک وقت نظر آرہی ہیں وہ سب زمین پر بیک وقت موجود نہیں ہوگئیں، بلکہ زمین پر ان کے ظہور میں ایک تاریخی ترتیب ہے، وہ یہ کہ سادہ انواع حیات سب سے پہلے ظہور میں آئیں۔ اس کے بعد بتدریج زیادہ پیچیدہ انواع حیات ظہور میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر انسان ظاہر ہوگیا۔ اس طرح واحد الخلیہ جاندار (Single cellular animal) زمین پر پہلے وجود میں آئے۔

اور انسان اس حیاتیاتی ترتیب کے سب سے آخر میں ظاہر ہوا۔

نظریہ ارتقاء کی عمارت جن مشاہدات پر قائم کی گئی ہے ان میں سب سے اہم مشاہدہ یہی ہے۔ نظریہ ارتقا کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ زندگی کی مختلف قسمیں ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئیں، یعنی زندگی کا ہر اگلا فارم اپنے پچھلے فارم سے نکلتا رہا۔ یہ ترقی ہر اگلی نسل میں جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ اس کے آخری مجموعہ نے وہ اعلیٰ صورت اختیار کرلی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

مگر یہ سراسر غلط تعبیر کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی حقیقی استدلال کا نتیجہ۔ خالص علمی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جو بات مشاہدہ میں آئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر انواع حیات کی موجودگی میں ایک زمانی ترتیب پائی جاتی ہے نہ یہ کہ انواع حیات ایک دوسرے کے بطن سے بطریق تناسل پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔

اصل مشاہدہ صرف تخلیق کی زمانی ترتیب کو بتا رہا تھا مگر غلط تعبیر کے ذریعہ اس کو زندگی کے ارتقائی ظہور کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ ارتقاء کے مشاہدات خالق (Creator) کی تردید نہیں کرتے، جیسا کہ خود چارلس ڈارون نے اپنی کتاب " اصل الانواع " میں تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ مشاہدات درست ہوں، تو وہ خالق کے تخلیقی عمل کی ترتیب کو بتاتے ہیں۔

یہ مختصر جائزہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیا کی راہ کا پہلا بنیادی کام اسلام کا فکری غلبہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ فکری غلبہ بظاہر دشوار ہونے کے باوجود انتہائی آسان ہے۔ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی مثالیں اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے لوگ اسلام کے نہایت سخت دشمن کے روپ میں ظاہر ہوئے مگر صرف ربع صدی کی دعوتی جدوجہد نے بتایا کہ اس طاقتور دشمن کے اندر طاقتور مددگار کی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل اسلام کے خلاف ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے۔ مگر ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں معلوم ہوا کہ یہ طاقتور تلوار صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر وہ اسلام کی طاقتور خادم اور محافظ بن جائے۔

یہی موجودہ زمانہ کے " اسلام دشمن " علوم کا معاملہ ہے۔

ان علوم نے بظاہر آج اسلام کو مغلوب کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کوششوں کو صحیح رخ سے جاری کر سکیں تو نصف صدی بھی نہیں گذرے گی کہ یہ سارا علم اسلام قبول کرلے گا۔ وہ اسلام کے علم کلام کی صورت اختیار کرلے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ جدید علمی قوت صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ وہ

خدا کے دین کی طاقت ور مددگار بن جائے۔

اسلام کے حق میں اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ضروری شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم دوسرے میدانوں میں اپنی جو قوت ضائع کر رہے ہیں اس کو سمیٹ کر اسی ایک میدان، فکری انقلاب لانے کے میدان میں لگا دیں۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ صحیح آغاز ہی دراصل صحیح اختتام کا دوسرا نام ہے۔

نوٹ : یہ مقالہ (انگریزی زبان میں) کوالالمپور کے انٹرنیشنل سمینار جولائی ۱۹۸۴ میں پیش کیا گیا۔

دور جدید میں قرآنی دعوت

مسلمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے مختلف فریضے عائد کیے ہیں۔ اپنے آپ کو خدا کا عبادت گزار بنانے سے لے کر مسلمانوں کی اصلاح تک بہت سی ذمہ داریاں ہیں جن میں مسلمان بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ذمہ داری وہ ہے جس کو اسلامی دعوت یا دعوت الی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلم اقوام تک خدا کے سچے دین کا پیغام پہونچانا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا عنوان نہیں بلکہ پیغمبر کی وراثت ہے جو ختم نبوت کے بعد مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔

امت مسلمہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں دعوت الی اللہ کے کام سے وابستہ کر دی ہیں۔ ایک طرف قرآن کے مطابق دعوت الی اللہ میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے (المائدہ ۶۷) دوسری طرف یہی وہ کام ہے جس کی ادائگی کے نتیجہ میں اہل ایمان آخرت میں خدا کی گواہی کے بلند مقام پر کھڑے کئے جائیں گے جس کو قرآن میں اصحاب اعراف (الاعراف ۴۶) کہا گیا ہے۔ یہ آخرت کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو داعیان حق کو دیا جائے گا۔

تاہم دعوت الی اللہ کا کام کوئی سادہ یا آسان کام نہیں۔ یہ رسول اور اصحاب رسول کی تاریخ کو از سر نو دہرانا ہے۔ یہ خدا کے بندوں کے سامنے خدا کا نمائندہ بننا ہے۔ یہ دنیا میں خدا کی حمد اور کبریائی کا نغمہ چھیڑنا ہے۔ یہ غیبی حقیقت کو لوگوں کے لئے مشہود حقیقت بنانا ہے۔ جو کچھ اس سے پہلے پیغمبرانہ سطح پر ہوتا رہا ہے اس کو غیر پیغمبرانہ سطح پر انجام دینا ہے۔ دعوت کی اصل نوعیت آدمی کے سامنے نہ ہو تو وہ دعوت کے نام پر ایک ایسا کام کرے گا جس کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

عالمی فضا کی تبدیلی

اس سلسلہ میں پہلی بات جس کو جاننا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے درمیان ہم کو دعوت حق کا کام انجام دینا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے لئے دعوت الی اللہ کا مطلب دور شرک کو ختم کرنا تھا۔ اب ہمارے لئے دعوت الی اللہ کا مطلب دور الحاد کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے اسلاف دور شرک کو ختم کر کے دور توحید لے آئے۔ اس کے بعد دنیا میں ایک نئی تاریخ وجود میں آئی۔ یہ تاریخ ہزار سال تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی میں مغربی سائنس کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دنیا کی ایک نئی تاریخ بننا شروع ہوئی۔ بیسویں صدی میں آکر یہ تاریخ اپنے کمال پر پہنچ گئی ہے۔ اب دوبارہ یہ حال ہو گیا ہے کہ ظہور ر

اسلام سے پہلے جس طرح فکر و عمل کے تمام شعبوں پر شرک کا غلبہ تھا، اسی طرح اب فکر و عمل کے تمام شعبوں پر الحاد کا غلبہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ آج مذہب بھی علمی طور پر الحاد کا ضمیمہ بن چکا ہے۔ اس سے الگ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے جو موجودہ زمانہ میں مذہب کی صورت کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ جرمن مفکر ای۔ ایف شوماخر نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> On a visit to Leningrad some years ago (August 1968) I consulted a map to find out where I was, but I could not make it out. I could see several enormous churches, yet there was no trace of them on my map. When finally an interpreter came to help me, he said: "We don't show churches on our maps."
>
> E.F. Schumacher,
> *A Guide for the Perplexed*, London, 1981, p. 9

اگست ۱۹۶۸ میں میں روس کے شہر لینن گراڈ گیا۔ وہاں ایک دن میں ایک نقشہ دیکھ رہا تھا تاکہ میں جانوں کہ میں کہاں ہوں۔ مگر میں اس کو جان نہ سکا۔ میری نظروں کے سامنے کئی بڑے بڑے چرچ تھے۔ مگر میرے نقشہ میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ بالآخر ایک ترجمان نے میری مدد کی۔ اس نے کہا: "ہم اپنے نقشوں میں چرچ کو نہیں دکھاتے"۔

یہ جزئی واقعہ اس پوری صورت حال کی تصویر ہے جو موجودہ زمانہ میں پیش آئی ہے۔ جدید انسان نے خدا کو اپنے تمام علمی اور فکری نقشوں سے نکال دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جغرافیہ، تاریخ، طبیعیات نباتات، حیوانات، فلکیات وغیرہ تمام علوم نہایت تفصیل کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں۔ مگر ان علوم میں کہیں بھی خدا کا ذکر نہیں۔ ایک شخص جس کو نظر حاصل ہو، جب وہ آنکھ اٹھا کر کائنات کو دیکھتا ہے تو ہر طرف اس کو خدا کا نشان نمایاں نظر آتا ہے، مگر مدوّن علوم میں خدا ہر جگہ ایک غیر موجود چیز ہے۔ ان علوم کو پڑھنے والا کہیں بھی خدا کا کوئی حوالہ نہیں پاتا۔

ان حالات میں دعوت توحید کا کام گویا خدا کو از سر نو فکر انسانی کے نقشہ پر لکھنا ہے۔ عالمی سطح پر ایک ایسا فکری انقلاب لانا ہے کہ انسان دوبارہ خدائی اصطلاحوں میں سوچنے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ توحید اور آخرت کی بات آدمی کی سمجھ میں آئے اور اس کو وہ حقیقت سمجھ کر قبول کر سکے۔ ہمارے اسلاف نے انسانی فکر کی دنیا میں شاکلۂ شرک کو توڑ کر شاکلۂ توحید کو قائم کیا تھا۔ اب ہم کو دوبارہ شاکلۂ الحاد کو توڑ کر شاکلۂ توحید پر انسانی فکر کا نظام قائم کرنا ہے۔ دعوت کے مسئلہ کا اس سے کم تصور دعوت کے مسئلہ کی تصغیر (Underestimation) ہے جس کی کوئی قیمت نہ بندوں کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

داعی اور مدعو کا تعلق

دوسرا اہم مسئلہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کرنا ہے۔ امت مسلمہ کی حیثیت سے مسلمان خدا کے دین کے داعی ہیں اور بقیہ تمام قومیں ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کو اپنا قومی حریف اور مادی رقیب بنالیا ہے۔ ان قوموں سے وہ ساری دنیا میں معاشی اور سیاسی جھگڑے چھیڑے ہوئے ہیں۔ قرآن میں داعی کا کلمہ لا اسئلکم علیہ من اجر بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں حقوق طلبی کے یہ تمام ہنگامے اپنی دعوتی حیثیت کی نفی کے ہم معنی ہیں۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے یہاں ہم کو خدا کے گواہ کا مقام حاصل ہو تو ہم کو یہ قربانی دینی ہوگی کہ دوسری اقوام سے ہمارے دنیوی جھگڑے، خواہ وہ بظاہر درست کیوں نہ ہوں، ان کو ہم یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تاکہ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہو، ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا وجود میں آئے جس میں ان کے سامنے توحید اور آخرت کی دعوت پیش کی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کر سکیں۔

صلح حدیبیہ (۶ ھ) میں مسلمانوں نے یک طرفہ طور پر مخالفین اسلام کے تمام معاشی اور قومی مطالبات مان لئے تھے۔ انھوں نے اپنے حقوق سے دستبرداری پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر دئے تھے۔ مگر جب مسلمان یہ معاہدہ کرکے لوٹے تو خدا کی طرف سے یہ آیت اتری ــــــ انا فتحنا لک فتحاً مبینا (الفتح ۱) بظاہر شکست کے معاہدہ کو خدا نے فتح کا معاہدہ کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاہدہ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مقابلہ کے میدان کو بدل دیا تھا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ایک ایسے میدان میں منتقل ہو گیا تھا جہاں اسلام واضح طور پر زیادہ بہتر حیثیت (Advantageous position) میں تھا۔

غیر مسلموں کی جارحیت کی وجہ سے اس وقت اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا۔ غیر مسلموں کے پاس ہر قسم کے زیادہ بہتر جنگی وسائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلسل غزوات کے باوجود معاملہ کا فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب حدیبیہ میں غیر مسلموں کے تمام قومی مطالبات مان کر ان سے یہ عہد لے لیا گیا کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک براہ راست یا بالواسطہ کوئی جنگ نہیں ہوگی۔

مسلسل جنگی حالات کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام رکا ہوا تھا۔ جنگ بند ہوتے ہی دعوت کا کام

پوری قوت کے ساتھ ہونے لگا۔ جنگی میدان میں اس وقت اسلام کمزور تھا۔ مگر جب مقابلہ پرامن تبلیغ کے میدان میں آگیا تو یہاں شرک کے پاس کچھ نہ تھا جس سے وہ توحید کی حقانیت کا مقابلہ کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے قبائل اتنی کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے کہ کفر کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور معاہدہ کے صرف دو سال کے اندر مکہ فتح ہوگیا۔

موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح کے ایک "معاہدہ حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے ہر جگہ مادی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مسلمان چوں کہ اپنی غفلت کی وجہ سے مادی پہلو سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہوگئے ہیں وہ ہر محاذ پر ان سے شکست کھا رہے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ یک طرفہ قربانی کے ذریعے ان محاذوں کو بند کرکے میدان مقابلہ کو بدل دیا جائے۔ ان قوموں کو مادی مقابلہ کے میدان سے ہٹا کر فکری مقابلہ کے میدان میں لایا جائے۔ قدیم زمانہ میں میدان مقابلہ کی یہ تبدیلی جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے حاصل کی گئی تھی، آج یہ تبدیلی قومی حقوق کی مہم کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے حاصل ہوگی۔

قومی مفادات کی یہ قربانی بلاشبہ ایک نہایت مشکل کام ہے مگر اسی کھونے میں پانے کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ مسلمان جس دن ایسا کریں گے اسی دن فتح اسلام کا آغاز ہو جائے گا۔ کیوں کہ فکری میدان میں کسی اور کے پاس کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ مادی مقابلہ کے میدان میں مسلمانوں کے پاس "روایتی ہتھیار" ہیں اور دوسری قوموں کے پاس "جدید ہتھیار"۔ جب کہ فکری میدان میں مسلمانوں کے پاس حقیقت ہے اور دوسری قوموں کے پاس تعصب، اور حقیقت کے مقابلہ میں تعصب دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔

لٹریچر کی تیاری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے قلم کے ذریعہ انسان کو تعلیم دی (علّم بالقلم، العلق) اس سے اسلامی دعوت کے لئے لٹریچر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

مگر اسلامی لٹریچر کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر کچھ کتابیں لکھی جائیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح مختلف زبانوں میں چھاپ کر تقسیم کردیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ بشری سطح پر قرآن کا بدل فراہم کرنا ہے۔

خدا نے اپنا کلام عربی زبان میں اتارا ہے۔ مگر اس کی تبلیغ دوسری زبان والوں تک بھی کرنی ہے، اور جیسا کہ ثابت ہے، مدعو کی اپنی زبان میں کرنی ہے (ابراہیم ۴) اس لحاظ سے اگر علّم بالقلم کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ابدی پس منظر (Perspective) میں رکھ کر دیکھا جائے تو یقینی طور پر انسان بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ دوسری زبانوں میں تعلیم بالقلم کا فریضہ انسان ہی کو ادا کرنا ہے۔

گویا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا عربی زبان میں معلّم بالقلم بنا تھا، اب ہم کو دوسری زبانوں میں معلم بالقلم بنا ہے۔ مشہور عرب شاعر لبید نے قرآن کو سن کر شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا کہ تم اب شاعری کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا، کیا قرآن کے بعد بھی (ابعد القرآن) اس کا مطلب یہ ہے قرآن نے اپنے زمانہ کے افراد کو ذہنی طور پر مفتوح کر لیا تھا۔ اسی طرح آج دوبارہ ایسا اسلامی لٹریچر درکار ہے جو لوگوں کو ذہنی طور پر مفتوح کر لے۔

بظاہر یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس ناممکن کو خود خدا نے ہمارے لئے ممکن بنا دیا ہے۔ خدا نے حق کے داعیوں کی مدد کے لئے انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب برپا کیا۔ یہاں میری مراد سائنسی انقلاب سے ہے۔ سائنسی انقلاب کے ذریعہ نئے استدلالی امکانات انسان کی دسترس میں آ گئے۔ حتی کہ بلا تشبیہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ مخاطب کے سامنے دین کے حق میں وہ اعجازی استدلال پیش کر سکیں جو پہلے صرف خدا کے پیغمبروں کی دسترس میں ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک عظیم الشان خدائی معجزہ ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے خالق کی ذات وصفات کے حق میں معجزاتی دلیل ہے۔ تاہم قدیم زمانہ میں یہ خدائی معجزہ ابھی تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس لئے خدا نے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو مخصوص طور پر خارق عادت معجزے دئے۔

مگر پیغمبر اسلام کے مخاطبین کے مسلسل مطالبہ کے باوجود انھیں مذکورہ قسم کا کوئی معجزہ نہیں دکھایا گیا۔ بلکہ قرآن میں کائنات کا حوالہ دیا گیا۔ کہا گیا کہ کائنات میں خدا کی آیات موجود ہیں ان کو دیکھو۔ وہی تمھارے یقین کے لئے کافی ہیں۔ چوں کہ قرآن دور سائنس کے آغاز میں آیا اس لئے قرآن میں کائنات کی نشانیوں کا حوالہ دینا کافی سمجھا گیا۔ ابدی پس منظر میں، قرآن کا مخاطب وہ انسان تھا جو دور سائنس میں جی رہا ہو۔ اور دور سائنس کے انسان کو خدا اور اس کی باتوں پر یقین کرنے کے لئے کسی خارق عادت معجزہ کی ضرورت نہیں۔

معجزہ سے کیا مطلوب ہے۔ معجزہ سے مطلوب محض کوئی حیران کن کرشمہ دکھانا نہیں بلکہ دعوت حق کو مخاطب کے لئے آخری طور پر ثابت شدہ بنانا ہے۔ دعوت کی موافقت میں ایسے دلائل جمع کرنا ہے جس کے بعد مخاطب کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ قدیم زمانہ میں اسی مقصد کے لئے خارق عادت معجزہ دکھایا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہی کام رموز فطرت کو منکشف کرکے سائنس نے انجام دے دیا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن میں پیغمبرانہ معجزوں اور کائناتی نشانیوں کے لئے ایک ہی مشترک لفظ استعمال ہوا

ہے اور وہ آیت (نشانی) ہے۔

خدا کے دین کی دعوت اتمام حجت کی حد تک مطلوب ہے (النساء ۱۶۵) اسی اتمام حجت کے لئے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ذریعہ معجزے دکھائے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی قوموں کے لئے بھی یہی مطلوب ہے کہ دین کی دعوت ان کے سامنے اتمام حجت کی حد تک پیش کی جائے۔ پھر موجودہ زمانہ میں اس کا ذریعہ کیا ہے جب کہ پیغمبروں کی آمد اب ختم ہو چکی ہے۔

جدید سائنسی انقلاب اسی سوال کا جواب ہے۔ جدید سائنسی انقلاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دین حق کی تعلیمات کو عین اس معیار پر ثابت کیا جا سکے جو انسان کا اپنا تسلیم شدہ معیار ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اہم ترین بات وہ ہے جو طریق استدلال (Methodology) سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید سائنس نے مختلف میدانوں میں اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں اس بات کا قطعی اقرار کیا ہے کہ استنباطی استدلال (Inferential Argument) اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول (Valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔ یہی قرآن کا طرز استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم انسانی نے قرآن کے طرز استدلال کو عین وہی درجہ دے دیا ہے جو علوم دینیہ سے باہر خود انسان کا تسلیم شدہ طرز استدلال ہے۔

جدید سائنس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جو چیز پہلے صرف خارجی اطلاع کی حیثیت رکھتی تھی وہ اب خود انسانی دریافت بن چکی ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ انسان اپنی محدودیت (Limitations) کی وجہ سے کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ کائنات میں تحکمی نظام (Arbitrary System) ہے اس سے واضح طور پر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور غیر مرئی متوازی دنیا موجود ہے جس کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ (Antiworld) ہے۔ اس سے واضح طور پر عالم آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ

اسی طرح مقناطیسی میدان (Magnetic Field) اور حرکت (Motion) کی یکجائی سے بجلی کی روشنی کا پیدا ہونا ویسا ہی ایک حیرت ناک خدائی معجزہ ہے جیسا ہاتھ کو بغل میں رکھ کر نکالنے سے ہاتھ کا غیر معمولی طور پر چمک اٹھنا، بڑے بڑے جہازوں کا اتھاہ سمندروں اور ناقابل عبور فضاؤں میں انسان کو لے کر دوڑنا ویسا ہی دہشت خیز خدائی معجزہ ہے جیسا دریا کا پھٹ کر انسانوں کو پار ہونے کا راستہ دینا۔ مادہ سے متحرک مشینوں کا وجود میں آنا ویسا ہی عجیب خدائی معجزہ ہے جیسا لاٹھی کا سانپ بن کر چلنے لگنا۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو جو معجزے دیئے گئے وہ سب باعتبار مواد استدلال خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔ مگر قدیم زمانہ میں چوں کہ وہ انسان کے علم میں نہیں آئے تھے اس لئے خدا نے لوگوں کو خارق عادت معجزے دکھائے۔ آج سائنسی تحقیقات نے فطرت کی یہ نشانیاں کھول دی ہیں اس لئے آج کے انسان کے یقین وایمان کے لئے وہی کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی انقلاب خدا کے معجزہ کا ظہور ہے۔ اس کے ذریعہ خدا کی تمام باتیں اعجازی سطح پر ثابت ہو رہی ہیں۔ اگر ان سے گہری واقفیت حاصل کی جائے اور ان کو دعوت حق کی حمایت میں استعمال کیا جائے تو یہ دعوت کے ساتھ معجزہ کو جمع کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آج ہم حقیقی معنوں میں سائنسی دلائل کے ساتھ دین کی دعوت پیش کر سکیں تو زمین پر دوبارہ یہ واقعہ ظہور میں آئے گا کہ وقت کا لبید یہ کہہ دے کہ ـــــ کیا حقیقت کے اس طرح ثابت ہو جانے کے بعد بھی۔

سائنسی استدلال موجودہ زمانہ میں معجزاتی استدلال کا بدل ہے۔ جدید سائنس نے تمام دینی تعلیمات کو علمی طور پر ثابت شدہ یا کم از کم قابل فہم (Understandable) بنا دیا ہے۔ تاہم اسلام کے داعیوں نے ابھی تک اس کو واقعی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ راقم الحروف نے اس موضوع پر دس سالہ مطالعہ کے بعد ۱۹۶۴ میں ایک کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) لکھی تھی جو عربی زبان میں الاسلام یتحدی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ تاہم پچھلے ۲۰ سال میں علم کا دریا بہت آگے جا چکا ہے۔ چنانچہ اب میں اس موضوع پر انشاء اللہ دوسری جامع تر کتاب تیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کا انگریزی نام (God Arises) ہوگا۔ وبید اللہ التوفیق۔

موافق امکانات

دعوت دین کا کام انتہائی مشکل کام ہے۔ مگر اللہ نے اپنی خصوصی رحمت سے اس کو ہمارے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں جس نے ہمارے لئے نئے مواقع کھول دئے۔ موجودہ زمانہ میں یہ تاریخی عمل اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ حتی کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جو کام پہلے "خون" کے ذریعے کرنا پڑتا تھا، اس کو اب قلم کی سیاہی کے ذریعے انجام دیا جا سکے۔

اس عمل تیسیر کے تین خاص پہلو ہیں جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔

۱۔ قرآن میں اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی گئی کہ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا (خدایا، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا)

اگر الفاظ بدل کر اس آیت کی تفسیر کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت توحید کا جو کام پچھلے داعیوں کو پابندی رائے کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا ، اس کو ہمیں آزادی رائے کے ماحول میں کرنے کا موقع عطا فرما۔ پہلے زمانہ میں یہ صورت حال تھی کہ توحید کا اعلان کرنے والے کو پتھر مارے جاتے۔ اس کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے جسم کو آرے سے چیر دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم تھی۔ پچھلے زمانہ کے بادشاہ مفروضہ دیوتاؤں کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے تھے۔ اس لئے جب کوئی شخص شرک کو بے بنیاد قرار دیتا تو اس زمانہ کے بادشاہوں کو محسوس ہوتا کہ وہ نظریاتی بنیاد ختم ہو رہی ہے جس پر انھوں نے اپنی حکومت کو قائم کر رکھا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے شرک کی اجتماعی حیثیت کو ختم کر کے اس کو ایک ذاتی عقیدہ بنا دیا۔ اب شرک الگ ہو گیا اور سیاسی ادارہ الگ۔ اس طرح وہ دور ختم ہو گیا جب کہ شرک لوگوں کے لئے اعلان توحید کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے ــــ وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جب توہم پرستی اور شخصی تقدس کا خاتمہ کیا تو نسلی بادشاہت کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جو بالآخر یورپ پہنچ کر جمہوریت (Democracy) کی صورت میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد شخصی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کا اصول دنیا میں رائج ہوا اور آزادیٔ رائے کو ہر آدمی کا مقدس حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس عالمی فکری انقلاب نے داعیان حق کے لئے یہ عظیم امکان کھول دیا کہ وہ غیر ضروری رکاوٹوں سے بے خوف ہو کر ساری دنیا میں حق کے اعلان کا کام انجام دے سکیں۔

۲۔ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ سنريهم اياتنا فى الآفاق و فى انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق (ہم عنقریب آفاق میں اور انفس میں ایسی نشانیاں دکھائیں گے جس سے کھل جائے کہ یہ سراسر حق ہے) قرآن کی اس آیت میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی دلیل ہے۔ تمام مخلوقات اپنے خالق کی صفات کا اظہار کر رہی ہیں۔ گویا کائنات قرآن کی دلیل ہے۔ تاہم یہ دلیل سائنسی انقلاب سے پہلے بڑی حد تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس دریافت کے لئے ضروری تھا کہ چیزوں کی گہرائی کے ساتھ

تحقیق کی جائے۔ مگر شرک کا عقیدہ اس تحقیق کی راہ میں حائل تھا۔ مشرک انسان کائنات کے مظاہر کو پرستش کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق کی چیز کیسے بناتا۔

توحید کے عمومی انقلاب نے اس رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اسلامی انقلاب کے بعد کائنات کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب کائنات کے مظاہر پر آزادانہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ یہ کام صدیوں تک عالمی سطح پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ یورپ پہنچا۔ یورپ میں اس کو موزوں زمین ملی۔ یہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ یہاں وہ عظیم فکری انقلاب ظہور میں آیا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنسی تحقیق کے ذریعے کائنات کے جو حقائق معلوم ہوئے ہیں وہ قرآن کی دعوت کو قطعیات کی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل راقم الحروف نے اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج (الاسلام یتحدی) میں کی ہے۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے خواہش مند ہوں وہ اس کتاب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۳۔ اس سلسلے میں تیسری چیز وہ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے —
عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا (قریب ہے کہ اللہ تم کو ایک مقام محمود پر کھڑا کرے)

محمود کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ تعریف دراصل تسلیم و اعتراف کی آخری صورت ہے۔ کسی کو ماننے والا جب اس کو ماننے کی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلیم شدہ نبوت کے مقام پر کھڑا کرے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں بھی محمود تھے اور آخرت میں بھی محمود۔ شفاعت کبریٰ جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ آخرت میں آپ کا مقام محمود ہے اور آپ کا تاریخی طور پر مسلم اور معترف ہونا دنیا میں آپ کا مقام محمود۔

خدا کی طرف سے ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ یہ سب سچے پیغمبر تھے۔ ان سب کا پیغام بھی ایک تھا۔ مگر مختلف اسباب سے ان پیغمبروں کو تاریخی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق آج کے انسان کے لئے ان پیغمبروں کی حیثیت نزاعی نبوت کی ہے نہ کہ مسلمہ نبوت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ جب کہ دوسرے نبیوں کی نبوت تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں۔ اس بنا پر آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم تسلیم شدہ (Established) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دے سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ متنازعہ (Controversial) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دینی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے (اسلامی نام: محمد عزیز الدین) ہندستان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ وہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر چٹو پادھیائے کو حق کی تلاش ہوئی۔ اس غرض سے انھوں نے ہندی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ زبانیں سیکھیں۔ انھوں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ مگر وہ کسی پر مطمئن نہ ہو سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پایا کہ یہ تمام مذاہب تاریخی معیار پر ثابت نہیں ہوتے۔ پھر کس طرح ان کی واقعیت پر یقین کیا جائے اور ان کو مستند سمجھا جائے۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام کی تعلیمات آج بھی اپنی اصل صورت میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اسلام کی شخصیات مکمل طور پر تاریخی شخصیات ہیں نہ کہ دیو مالائی شخصیات۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے پایا کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں کوئی چیز مبہم اور دھندلی نہیں۔ اور نہ پراسرار یا دیو مالائی ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر، زرتشت اور شری کرشن کے یہاں، حتیٰ کہ بدھ اور مسیح کے یہاں ہے۔ دیگر پیغمبروں کے وجود تک کے بارہ میں اہل علم نے شبہہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ انکار کیا ہے مگر جہاں تک میں جانتا ہوں، پیغمبر اسلام کے بارہ میں کوئی یہ جرأت نہ کر سکا کہ ان کو توہماتی عقیدہ یا پریوں کی کہانی کہہ سکے"۔

اس کے بعد ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے کہتے ہیں:

Oh, what a relief to find, after all,
a truly historical Prophet to beleive in.
Why have I Accepted Islam, Dr Nishikanta Chattopadhya.

اُف، کیسا عجیب تسکین کا سامان ہے کہ بالآخر آدمی واقعی معنوں میں ایک تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ ایمان لا سکے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں مقام محمود (الاسراء ۷۹) کہا گیا ہے۔ نبوتِ تاریخی ہی کا دوسرا نام نبوت محمودی ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے پیغمبروں کی طرح، تاریخی طور پر کوئی نامعلوم شخصیت یا غیر ثابت شدہ شخصیت نہیں ہوں گے، بلکہ آپ تمام انسانوں کے لئے پوری طرح ایک معلوم اور مسلّم شخصیت ہوں گے۔ آپ کی سیرت بھی ایک محفوظ سیرت ہوگی اور آپ کی تعلیم بھی ایک محفوظ تعلیم۔

یہ داعیان اسلام کے لئے موجودہ زمانہ میں بہت بڑا Advantage ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے میدان میں وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

انسان پیدائشی طور پر اپنی فطرت میں خدا کی طلب لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو سچائی کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ انسانی علوم میں اپنی طلب کا جواب دریافت کرنا چاہتا ہے مگر وہ دریافت نہیں کر پاتا۔ پھر وہ مذاہب کا مطالعہ کرتا ہے تو پاتا ہے کہ موجودہ تمام مذاہب تاریخی پہلو سے غیر محفوظ ہیں۔ ان کو تاریخی اعتباریت (Historical credibility) کا درجہ حاصل نہیں۔ یہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ انسان سے کہہ سکیں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ محفوظ اور مستند حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے۔ دوسروں کے پاس صرف غیر تاریخی پیغمبر ہیں جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسلام کا پیغمبر مکمل طور پر ایک تاریخی پیغمبر ہے۔ تاریخ کے مسلمہ معیار کے مطابق آپ کے بارہ میں کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ دوسروں کے پاس متنازعہ نبوت ہے اور اسلام کے پاس مسلمہ نبوت۔

یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس نے ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے دین کی دعوت آج مسلّمہ نبوت کی سطح پر دی جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف متنازعہ نبوت کی سطح پر دی جا سکتی تھی۔

مخالفانہ عمل کو ختم کرنا

موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا کام در اصل جدید اقوام پر اتمام حجت کے ہم معنی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ جس کے لئے عظیم الشان وسائل اور غیر معمولی موافق حالات درکار ہیں۔ یہ وسائل اور حالات مسلم ملکوں میں یقینی طور پر مل سکتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت مل سکتے ہیں جب کہ مسلم حکومتوں کو اسلامی دعوت کا حریف نہ بنایا جائے۔

۱۸۹۱ کا واقعہ ہے کہ جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) کا ایک خط ترکی کے سلطان عبد الحمید ثانی کو ملا۔ اس خط میں سلطان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلم مبلغین کو جاپان بھیجے تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو اسلام سے واقف کرائیں۔ سلطان عبد الحمید نے اس اہم کام کے لئے سید جمال الدین افغانی کا انتخاب کیا اور ان کو ہر طرح کے سرکاری تعاون کا یقین دلایا۔

مگر یہی سید جمال الدین افغانی جن کو سلطان عبد الحمید نے اس قدر احترام اور تعاون کا مستحق سمجھا تھا، بعد کو اسی سلطان نے سید جمال الدین افغانی کو جیل میں بند کر دیا۔ حتیٰ کہ جیل خانہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کو معلوم ہوا کہ سید جمال الدین افغانی اس کے خلاف سیاسی سازش میں مشغول ہیں۔ جمال الدین افغانی سلطان کو مغربی استعمار کا ایجنٹ سمجھتے تھے اور اس کو تخت سے بے دخل کر دینا چاہتے تھے۔ جو شخص جاپان میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کرنے والا بن سکتا تھا وہ صرف جیل کے رجسٹر میں اپنے نام کا اضافہ کر کے رہ گیا۔

یہی تمام مسلم حکمرانوں کا حال ہے۔ اگر آپ اسلامی دعوت کے کام میں مشغول ہوں تو وہ ہر طرح کا اعلیٰ ترین تعاون آپ کو دیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کے خلاف سیاسی مہم چلائیں تو وہ آپ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلسل سید جمال الدین افغانی کے اسوہ کو دہرایا جا رہا ہے۔ مسلمان کہیں ایک عنوان سے اور کہیں دوسرے عنوان سے، اپنے حکمرانوں کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول ہیں۔ حتیٰ کہ آج "اسلامی دعوت" کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لئے سیاسی اپوزیشن کے ہم معنی بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ نقصان ہوا ہے کہ اسلامی دعوت کی مہم میں مسلم حکومتوں کا بھرپور تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص حکومت سے بے نیاز ہو کر ذاتی طور پر اس ذمہ داری کو ادا کرنا چاہے تو حکومت اس کو شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، خواہ وہ اسلام کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ تاکہ ہر مسلم ملک میں اسلامی کارکنوں کو ان کی قومی حکومتوں کا تعاون حاصل ہو اور اسلام کے احیاء کا کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا جا سکے، غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے بھی اور خود مسلمانوں کی اپنی تعمیر و اصلاح کے لئے بھی۔

افراد کار کی فراہمی

دعوت اسلامی کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور موجودہ مواقع کو استعمال کرنے کے لئے افراد کار کی ضرورت ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ منتخب لوگ مخصوص تربیت کے ذریعہ اس مقصد کے لئے تیار کیے جائیں۔ وہ دین میں تفقہ حاصل کرکے مختلف قوموں میں جائیں اور ان کو توحید کی تعلیم دیں اور آخرت سے آگاہ کریں (فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم، التوبہ ۱۲۲)

آج دنیا میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے اور تعلیم کے ادارے ہیں۔ مگر ساری دنیا میں کوئی ایک مدرسہ بھی خاص اس مقصد کے لئے موجود نہیں جہاں خالص دعوتی ضرورت کے تحت لوگوں کی تعلیم و تربیت کی جائے تاکہ وہ وقت کی ضرورت کے مطابق تیار ہو کر موثر انداز میں لوگوں کے اوپر دعوت الی اللہ اور انذار آخرت کا کام کریں۔ آج کی ناگزیر ضرورت ہے کہ ایسی ایک تعلیم گاہ قائم کی جائے اور اس کو معیار کے مطابق بنانے کے لئے ہر وہ قیمت ادا کی جائے جو موجودہ حالات میں ضروری ہے۔

افراد کار کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو صرف "باعلم" نہیں بلکہ "با مقصد" ہونا چاہئے۔ مقصد کے بغیر علم صرف معلومات ہے۔ مگر علم جب مقصد کے ساتھ ہو تو وہ معرفت بن جاتا ہے۔ اگر ایک ایسی تعلیم گاہ قائم ہو جہاں ڈگری یافتہ اساتذہ کے ذریعے لوگوں کو قدیم وجدید علوم پڑھا دیے جائیں تو صرف اس بنا پر وہ مطلوبہ داعی نہیں بن جائیں گے۔ ضروری ہے کہ ان کے سینہ میں مقصد کی آگ لگی ہوئی ہو۔ کیوں کہ مقصد ہی لوگوں کے اندر وہ اعلیٰ فکر اور اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ دعوت کے میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

خواہ کوئی دنیوی مقصد ہو یا دینی مقصد، دونوں ہی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ہر قسم کی ضروری قربانی دے سکیں۔

ٹائمس (The Times) لندن کا ایک قدیم اخبار ہے۔ اس اخبار میں ۱۹۰۰ میں ایک اشتہار چھپا۔ اس اشتہار کے ساتھ نہ عورتوں کی تصویریں تھیں نہ کسی قسم کے بناوٹی تماشے۔ اس میں ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں حسب ذیل الفاظ درج تھے ——— ایک جوکھم کے سفر کے لئے آدمی درکار ہیں۔ معمولی رقم، سخت سردی، مکمل تاریکی کے لمبے مہینے، مسلسل خطرہ، محفوظ واپسی مشتبہ۔ کامیابی کی صورت میں عزت اور اعتراف:

> Men wanted for Hazardous Journey. Small wages, bitter cold, long months of complete darkness, constant danger safe return doubtful. Honour and recognition in case of success.
>
> —Sir Ernest Shackleton

یہ اشتہار قطب جنوبی کی مہم کے لئے تھا۔ اس کے جواب میں اتنی زیادہ درخواستیں آئیں کہ ذمہ داروں کو ان میں سے انتخاب کرنا پڑا۔ اسی قسم کے بلند ہمت لوگ تھے جو مغرب میں سائنسی انقلاب لائے اور اہل مغرب کے لئے عالمی قیادت کی راہ ہموار کی۔

مذکورہ بالا مثال ایک دنیوی مثال تھی۔ یہی معاملہ ان لوگوں کا بھی ہے جنھوں نے اسلام کی تاریخ بنائی۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار مدینہ کے نمائندہ افراد سے رسول اللہ صلے اللہ کی گفتگو اس کی نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔ یہاں ہم سیرۃ ابن ہشام کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں:

قال کعب ثم خرجنا الی الحج وواعدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العقبۃ من اوسط ایام التشریق فلما فرغنا من الحج وکانت اللیلۃ التی واعدنا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم وکنا نکتم من معنا من قومنا من المشرکین امرنا ... قال فنمنا تلک اللیلۃ مع قومنا فی رحالنا حتی اذا مضیٰ ثلث اللیل خرجنا من رحالنا لمیعاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نتسلّل تسلل القطا

مستخفین حتی اجتمعنا فی الشعب عند العقبة ونحن ثلاثة وسبعون رجلا ومعنا امرأتان من نسائنا ٤٩

قال ابن اسحاق وحدثنی عاصم بن عمر بن قتادة ان القوم لما اجتمعوا لبیعة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال العباس بن عبادة بن نضلة الانصاری یا معشر الخزرج هل تدرون علام تبایعون هذا الرجل قالوا نعم قال انکم تبایعونه علی حرب الاحمر والاسود من الناس فان کنتم ترون انکم اذا نهکت اموالکم مصیبة واشرافکم قتل اسلمتموه فمن الآن فهو واللہ ان فعلتم. خزی الدنیا والآخرة وان کنتم ترون انکم وافون له بما دعوتموه الیه علی نهکة الاموال وقتل الاشراف فخذوه فهو واللہ خیر الدنیا والآخرة قالوا فانا ناخذه علی مصیبة الاموال وقتل الاشراف فما لنا بذلك یا رسول اللہ ان نحن وفینا قال الجنة قالوا ابسط یدك فبسط یده. فبایعوه (۵۵) سیرة النبی لابی محمد عبدالملك بن هشام الجزالثانی ..

اسی قسم کے باشعور اور باہمت اصحاب تھے جنھوں نے تاریخ میں شرک کے تسلسل کو ختم کیا اور انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔ آج دوبارہ تاریخ کو وہی حرکت دینے کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف نے اپنے زمانہ میں دیا تھا۔ انھوں نے شرک کا دور ختم کرکے توحید کا دور شروع کیا۔ اب ہم کو الحاد کا دور ختم کرکے دوبارہ توحید کا دور انسانی تاریخ میں لانا ہے۔ یہ ایک بہت اعلیٰ کام ہے۔ اور اس کے لئے اعلیٰ افراد انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایسے افراد تیار کئے جائیں۔ ڈاکٹر فلپ۔ کے ہٹی کے الفاظ میں، آج اسلام کو دوبارہ ایک ہیروؤں کی نرسری (Nursery of heroes) درکار ہے۔ اس کے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں پاسکتا۔ مذکورہ درس گاہ گویا اسی قسم کی ایک نرسری ہوگی جہاں دعوت اسلامی کے ہیرو تیار کئے جائیں۔

دعوتی مرکز کا قیام

اوپر میں نے ڈاکٹر نشی کانت چیٹو پادھیا (اسلامی نام محمد عزیز الدین) کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ۱۹۰۴ کے لکچر میں قدیم حیدرآباد میں کہا تھا:

I feel sure, that if a comprehensive Islamic mission were started in Hyderabad (India) to preach the simple and sublime truths of Islam to the people of Europe, America and Japan, there would be such rapid and enormous accession to its ranks as has not been witnessed again ever since the first centuries of the Hejira. Will you, therefore, organise a grand central Islamic Mission here in Hyderabad and open branches in Europe, America and in Japan?

Why have I Accepted Islam, Dr. Nishikanta Chattopadhya.

مجھ کو یقین ہے کہ اگر حیدر آباد میں ایک مکمل اسلامی مشن شروع کیا جائے جس کا مقصد اسلام کی صاف اور سادہ سچائیوں کی تبلیغ ہو اور اس کو یورپ، امریکہ اور جاپان کے لوگوں تک پہنچایا جائے تو اسلام اتنی تیز اور عظیم سطح سے نفوذ کرے گا جس کی مثال پہلی صدی ہجری کے بعد دوبارہ نہیں دیکھی گئی۔
کیا آپ لوگ اسلامی مشن کا ایک عظیم مرکز حیدر آباد (ہندستان) میں بنائیں گے جس کی شاخیں یورپ امریکہ اور جاپان میں ہوں۔ (واضح ہو کہ حیدر آباد کا لفظ یہاں محض اتفاقی ہے۔ اس سے مراد کوئی بھی مناسب شہر ہے نہ کہ صرف حیدر آباد)

ایک سعید مسلم روح نے ۸۰ سال پہلے یہ بات کہی تھی۔ مگر بد قسمتی سے ابھی تک یہ واقعہ نہ بن سکی۔ آج سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا عظیم دعوتی مرکز قائم کیا جائے جو تمام جدید وسائل سے لیس ہو۔ جہاں ہر قسم کے ضروری دعوتی اور تربیتی شعبے قائم ہوں۔ اور اسی کے ساتھ وہ ہر قسم کی سیاست اور ہر قسم کے قومی جھگڑوں سے الگ ہو کر کام کرے۔ ایک اعلیٰ دعوتی مرکز کے ساتھ اگر یہ چیزیں جمع کر دی جائیں تو یقینی ہے کہ اسلام کی وہ نئی تاریخ دوبارہ بننا شروع ہو جائے گی جس کا ہم مدت سے انتظار کر رہے ہیں مگر وہ ابھی تک ظہور میں نہ آسکی۔

نوٹ : یہ مقالہ (عربی زبان میں) الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ منورہ) کے القاعۃ الکبریٰ میں ۲ مارچ ۱۹۸۴ کو پڑھ کر سنایا گیا۔

حرف آخر
ابدی صداقت

یریدون ان یطفؤا نور اللّٰہ بافواھھم
ویابی اللّٰہ الا ان یتمّ نورہ

التوبہ ۳۲

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالاں کہ اللہ اپنی روشنی کو کمال تک پہونچائے بغیر ماننے والا نہیں۔

ابدی صداقت

حضرت موسیٰ ۱۵ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں پیدا ہوئے۔ ان کو خدا نے اپنا پیغمبر مقرر کیا۔ اس وقت مصر میں ایک مشرک خاندان کی حکومت تھی جو اپنے کو فراعنہ کہتے تھے۔ حضرت موسیٰ کا سابقہ اس خاندان کے دو بادشاہوں سے پیش آیا۔ ایک وہ جس کو خدا نے بچپن میں آپ کی پرورش کا ذریعہ بنایا۔ دوسرا وہ جس سے آپ کا مقابلہ پیش آیا۔

حضرت موسیٰ نے جب فرعون مصر کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا تو وہ آپ کا مخالف ہو گیا حضرت موسیٰ نے عصا کے سانپ بن جانے کا معجزہ دکھایا تو اس نے کہا کہ یہ جادو ہے اور ایسا جادو ہم بھی دکھا سکتے ہیں۔ فرعون نے حکم دیا کہ اگلے قومی میلہ کے موقع پر مصر کے تمام جادوگروں کو اکٹھا کیا جائے۔ وہ اپنے جادو کے کمالات دکھا کر موسیٰ کے معجزے کو باطل ثابت کریں۔ چنانچہ مقرر وقت پر ملک کے تمام جادوگر اکھٹا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ جب میدان میں آئے تو اس وقت انہوں نے ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

قال موسیٰ ماجئتم به السحر ان الله سيبطله ان الله لا يصلح عمل المفسدين ويحق الله الحق بكلماته ولو كره المجرمون۔ (یونس ۸۲-۸۱)

موسیٰ نے جادوگروں سے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔ اللہ اس کو یقیناً باطل کردے گا۔ بیشک اللہ مفسدین کے کام بننے نہیں دیتا۔ اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کر دیتا ہے، اگرچہ مجرم لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

حضرت موسیٰ نے اس وقت جو کچھ کہا وہ دراصل پیغمبر کی زبان سے خدا کے ابدی فیصلہ کا اعلان تھا۔ موجودہ دنیا میں امتحان کی آزادی ہے۔ اس لیے یہاں ہر باطل کو ابھرنے کا موقع

مل جاتا ہے ۔ مگر یہ ابھار ہمیشہ وقتی اور عارضی ہوتا ہے دنیا کا نظام اتنا کامل اور معیاری ہے کہ وہ زیادہ دیر تک باطل کو قبول نہیں کرتا ۔ وہ ہر خلافِ حق بات کو ایک عرصہ کے بعد رد کر دیتا ہے ۔ اور بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جو حق ہے ۔

خدا کے اس قانون کا ظہور پچھلے زمانہ میں بھی ہوا اور موجودہ زمانے میں بھی ہو رہا ہے ۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں معجزہ کے ذریعہ جادوگروں کے جادو کو باطل ثابت کیا گیا تھا ۔ پچھلے زمانوں میں یہ واقعہ بار بار ایک یا دوسری شکل میں پیش آتا رہا ہے ۔ موجودہ زمانہ میں خود علم انسانی کے ذریعہ خدا نے اس مقصد کو حاصل کیا ہے ۔ نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں اس سلسلہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس کا ذکر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے :

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انه الحق اولم یکف بربك انه علٰی کلّ شئٍ شھید ۔	ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے ، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی ۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے ۔ کیا تمہارے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے ۔

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے :

سنظھر لھم دلالاتنا وحُجَجَنا علٰی کون القراٰن حقاً منزّلاً من عند اللہ علٰی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بدلائل خارجیة ۔	عنقریب ہم قرآن کے حق اور اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ہونے کو خارجی دلائل اور براہین کے ذریعہ ان کے لیے ظاہر کر دیں گے ۔

قرآن کی مذکورہ آیت کو ابدی پس منظر میں دیکھنا چاہیے ۔ یہ گویا ایک ایسی ہستی بول رہی ہے جس کے سامنے وقت کے انسان بھی ہیں اور مستقبل میں پیدا ہونے والے انسان بھی ۔۔ یہ آیت وقت کے مخاطبین کے ساتھ اگلی نسلوں کو سمیٹتی ہوئی کہہ رہی ہے کہ آج جو بات علم وحی کی بنیاد پر کہی جا رہی ہے وہ آیندہ خود علمِ انسانی کے زور پر صحیح ثابت ہوگی ۔ جو چیز آج خبر ہے وہ کل واقعہ بن جائے گی ۔

قرآن کی یہ پیشگی خبر بعد کے دور میں نہایت کامل طور پر صحیح ثابت ہوئی ہے ۔ قدیم زمانہ

میں جب جادوگروں نے حق کے مقابلہ میں جادو کو کھڑا کیا تو خدا نے اس کو ڈھا دیا۔ موجودہ زمانہ میں علم کے زور پر الحاد و انکار کا دعویٰ کھڑا کیا گیا تو اس کو بھی خدا نے ہباءً منثوراً بنا دیا۔ اسی طرح جس نے بھی کوئی چیز حق کے خلاف کھڑی کی وہ ہمیشہ ڈھا دی گئی۔ قدیم زمانے سے لیکر حال کے دور تک کبھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ خدا کا کلام اپنی صداقت کو مسلسل بلاانقطاع باقی رکھے ہوئے ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)
مطالعہ سیرت
اسباق تاریخ
تعمیر حیات
تعمیر انسانیت
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفر نامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم
اسلام: ایک تعارف
اللہ اکبر
پیغمبر انقلاب
مذہب اور جدید چیلنج
عظمت قرآن
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
دین کامل
الاسلام
ظہور اسلام
اسلامی زندگی
احیاء اسلام
راز حیات
صراط مستقیم
خاتونِ اسلام
سوشلزم اور اسلام
اسلام اور عصر حاضر
الربانیۃ
کاروانِ ملت
حقیقت حج
اسلامی تعلیمات
اسلام دور جدید کا خالق
حدیث رسول
راہ عمل
تعبیر کی غلطی
دین کی سیاسی تعبیر
عظمتِ مومن

اسلام: ایک عظیم جدوجہد
تاریخ دعوت حق
مطالعہ سیرت (کتابچہ)
ڈائری (جلد اول)
کتاب زندگی
اقوالِ حکمت
تعمیر کی طرف
تبلیغی تحریک
تجدید دین
عقلیاتِ اسلام
قرآن کا مطلوب انسان
دین کیا ہے؟
اسلام دین فطرت
تعمیر ملت
تاریخ کا سبق
فسادات کا مسئلہ
انسان اپنے آپ کو پہچان
تعارف اسلام
اسلام پندرہویں صدی میں
راہیں بند نہیں
ایمانی طاقت
اتحاد ملت
سبق آموز واقعات
زلزلہ قیامت
حقیقت کی تلاش
پیغمبر اسلام
آخری سفر
اسلامی دعوت
حل یہاں ہے
امہات المومنین
تصویر ملت
دعوت اسلام
دعوت حق
نشری تقریریں

دین انسانیت
فکر اسلامی
شتم رسول کا مسئلہ
طلاق اسلام میں
مضامین اسلام
حیات طیبہ
باغ جنت
نار جہنم
سچا راستہ
دینی تعلیم
خلیج ڈائری
رہنمائے حیات
تعدد ازواج
ہندستانی مسلمان
روشن مستقبل
صوم رمضان
اسلام کا تعارف
علما اور دور جدید
سفر نامہ اسپین و فلسطین
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
یکساں سول کوڈ
اسلام کیا ہے؟
میوات کا سفر
قیادت نامہ
منزل کی طرف
اسفار ہند
ڈائری ۹۰-۱۹۸۹
قال اللہ و قال الرسول
ڈائری ۹۲-۱۹۹۱
مطالعۂ قرآن
مذہب اور سائنس